Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر
نومبر
1977

وہ کتاب جو صدیوں تک زندہ رہے گی

تبویب القرآن

تعارف اندر ملاحظہ فرمائیے

(اس پرچہ کی قیمت -/3 روپے)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ـــ ۱۸/ روپے
غیر ممالک ـــ ۳ پونڈ

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت اس پرچہ کی
۳
تین روپے

جلد ۳۰
اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء
شمارہ ۱۰/۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ---------- ۲
۲۔ تبویب القرآن از مفکرِ قرآن ---------- ۱۷
۳۔ خدا کی گرفت ---------- ۳۳
۴۔ نظریۂ پاکستان پر کیا گذری! ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۴۹
۵۔ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۷۳
۶۔ قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟ ---- (محترم پرویز صاحب) ---- ۹۷

* * *

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس۔ ۷ اسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

لمعات

نہ اسلامی نہ جمہوری

ہوائیں معمول کے مطابق چل رہی ہوں تو ان کا رُخ متعین ہوتا ہے، اور جس شخص کو موسمی تغیرات کا تھوڑا بہت علم یا تجربہ ہو وہ قیاساً بتا سکتا ہے کہ اس کے بعد فلاں ہوا کا رخ کس سمت کو ہوگا۔ لیکن جب جھکڑ چل رہے ہوں تو نہ تو کسی ہوا کا رُخ متعین ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کے بعد ہواؤں کا رخ کس کس سمت کو ہوگا۔ پاکستانی سیاست میں جو جھکڑ اس وقت چل رہا ہے اس کی مثال گذشتہ تیس سال میں نہیں مل سکتی۔ اس سلسلہ میں ہمیں ملک کے چاروں اطراف سے جو استفسارات موصول ہو رہے ہیں وہ قوم کی پریشانیٔ فکر و نظر اور کرب و اضطرابِ قلب و دماغ کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں بیشتر استفسارات تو اس نوعیت کے ہیں کہ ملک کی کونسی پارٹی برسرِحق ہے اور ہم کس کا ساتھ دیں۔ ایسے سوالات کے جواب میں ہم اپنے اس مؤقف کو دہرا دینا چاہتے ہیں جسے ہم بارہا پیش کر چکے ہیں کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ ہی نہیں لیتے اس لئے ہمارے ہاں پارٹیوں کی تائید یا تردید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اُمت میں پارٹیوں (اور فرقوں) کے وجود ہی کو خلافِ قرآن سمجھتے ہوں ان سے پارٹیوں میں فرق اور امتیاز کے متعلق پوچھنا لاحاصل ہے۔ باقی رہا کسی کا برحق ہونا تو ہمارے نزدیک برحق تو صرف وہ ہے جو فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ۔ (۵/۴۸) کا پابند ہو۔ یعنی قرآن مجید کو حَکم اور حاکم ماننے کا پابند۔ اور اس معیار پر کوئی پارٹی بھی پوری نہیں اترتی۔

دوسری قسم کے سوالات اس نوعیت کے ہیں کہ پاکستان میں ہماری سیاسی ناکامی اور تشتت و انتشار کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا (قرآنی راہ نمائی میں) جواب دینا ہمارا فریضہ ہے، اور یہ سطور اس فریضہ کی ادائیگی کے طور پر سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔ اس نہایت اہم سوال کا مختصر ترین الفاظ میں جواب یہ ہے کہ اس کا بنیادی سبب وہ افسوں ہے جو ایک خاص سازش کے تحت ہمارے کان میں پھونکا گیا کہ "جمہوریت عین مطابقِ اسلام ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ جمہوریت سے مراد مغرب کا جمہوری نظام تھا۔ مغربی قوتوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے تحت یہ افسوں ہمارے کان میں پھونکا، اور ان کے ایجنٹ اسے مسلمانوں کے دل میں جاگزیں کرنے میں مصروفِ کار ہیں۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اب اسے ایک مسلّمہ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے کہ "جمہوریت عین مطابقِ اسلام" ہے۔

جس مردِ خود آگاہ و خدا مست نے ہمیں اسلام کے نظریۂ قومیت اور اس کے سیاسی نظام کے قرآنی مفہوم سے آگاہ کیا تھا، اسی نے مغرب کے جمہوری نظام کی تباہ کاریوں سے بھی قوم کو متنبہ کر دیا تھا۔ انہوں نے (بانگِ درا میں بہت پہلے) کہہ دیا تھا کہ :ـ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد، جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اسی حقیقت کو انہوں نے (زبورِ عجم میں) ان الفاظ میں دہرایا :ـ

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است   رسن از گردنِ دیوے کشاد است
زمن دِہ اہلِ مغرب را پیامے   کہ جمہور است تیغِ بے نیامے!

بالِ جبریل میں ایک نہایت لطیف و نظیف نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "ابلیس کی عرضداشت" بحضورِ خداوندِ جہاں۔ اس میں ابلیس یہ عرض گذارتا ہے کہ خطۂ ارض پر میری اب ضرورت نہیں رہی، اس لئے مجھے واپس بلا لیا جائے۔ اس لئے کہ :ـ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست   باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

وہ ان امراض کی تشخیص کرتے ہوئے جن میں اس وقت عالمگیر انسانیت مبتلا ہے، کہتے ہیں کہ :ـ

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید   وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بَری   جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

چونکہ علامہ اقبالؒ کی یہ تشخیص، قرآنی بیاض سے مقتبس تھی اس لئے طلوعِ اسلام بھی ۱۹۳۸ء سے اس کے عام کرنے میں مصروفِ سعی و کاوش چلا آ رہا ہے۔

ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ ہم مغرب کے جمہوری نظام کے نہیں بلکہ اسلامی جمہوریت کے داعی ہیں۔ اس پیوند سازی میں اسلام سے مراد مروّجہ مذہب ہوتا ہے اور جمہوریت سے مقصود بہرحال مغرب کا جمہوری نظام۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو ملغوبہ تیار ہوتا ہے وہ ہمارے امراض کا اصل سبب ہے۔ خالص (سیکولر) جمہوری نظام کفر ہی سہی، پھر بھی اپنے کچھ نتائج تو مرتب کر دیتا ہے، لیکن جب اس کے ساتھ مذہب کا پیوند لگا دیا جائے تو صورت وہ پیدا ہو جاتی ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ :ـ

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۔

کیا تم کتابِ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۔ (۲/۸۵)

یاد رکھو! جو بھی کفر و ایمان میں اس قسم کی پیوند سازی کرے گا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا۔

ہم اسی عذاب میں مبتلا ہیں ـــــ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے :ـ

مغربی جمہوریت کے عناصرِ ترکیبی حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) ایک خطۂ ارض (یا مملکت) کے اندر بسنے والے تمام افراد، بلا لحاظ عقیدہ و مذہب، ایک قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۲) اس قوم میں سیاسی اختلافات کی بنا پر مختلف سیاسی پارٹیاں وجود میں آتی ہیں۔

(۳) یہ سیاسی پارٹیاں انتخاب لڑتی ہیں اور اکثریت کی پارٹی برسرِ اقتدار آ جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چونکہ اس پارٹی کا سیاسی نصب العین متعین ہوتا ہے اس لئے اس کے ارکان میں وحدتِ فکر و عمل ہوتی ہے۔ ہم آہنگ افراد کے بغیر نہ کوئی پارٹی وجود میں آ سکتی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے۔

(۴) پارلیمان میں، برسرِ اقتدار پارٹی کے بالمقابل اس کی حریف پارٹی موجود رہتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایوان میں حزبِ اقتدار کے ساتھ حزبِ اختلاف کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔

(۵) مجلسِ قانون ساز (پارلیمان) افرادِ مملکت کے مذہبی عقائد و مسالک و رسومات سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی۔ اور مختلف فرقوں کو شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اس میں مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جاتا ہے۔

(۶) امورِ مملکت کے فیصلے پارلیمان کی اکثریت، بلا حدود و قیود، کر سکتی ہے۔ یہ فیصلے ملکی قوانین (پبلک لاز) کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوتے ہیں اور ان کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوتا ہے۔

(۷) برسرِ اقتدار پارلیمان، ان قوانین میں، جب چاہے، ردّ و بدل بھی کر سکتی ہے۔ اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ اس نظام میں کوئی عنصر غیر متبدل نہیں ہوتا۔ ہر معاملہ میں اکثریت کا فیصلہ قولِ فیصل ہوتا ہے۔

* * *

اس کے برعکس، قرآنی نظام کے عناصرِ ترکیبی حسبِ ذیل ہوتے ہیں:-

(۱) قومیت کا معیار، وطن کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان (دین) کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خطۂ ارض (یا مملکت) کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم، ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ مسلم قوم کے افراد صرف مسلم ہو سکتے ہیں۔ اسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

(۲) امتِ مسلمہ، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ یعنی اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے، نہ سیاسی پارٹیاں۔

(۳) اس امت کی مملکت میں، قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ جملہ قوانین، اصول و اقدار و حدود کی شکل میں، خدا کے مقرر کردہ اور اس کی کتاب (قرآن مجید) کے اندر منضبط اور محفوظ ہیں۔ ان میں نہ کوئی ردّ و بدل کر سکتا ہے، اور نہ ہی حک و اضافہ۔

(۴) مملکت کا فریضہ، قرآنِ مجید کے ان غیر متبدل اصول و اقدار کو ملک میں عملاً نافذ کرنے کی تدابیر اور طریقے وضع کرنا ہوتا ہے۔ جب یہ اصول و اقدار، ان طریقوں کے مطابق نافذ ہوں تو انہیں اسلامی شریعت یا اسلامی قوانین کہا جاتا ہے۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پہ یکساں ہوتا ہے اور ان میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق نہیں ہوتی۔ یہ اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کے نافذ کرنے کے طور طریقے عندالضرورت بدلے جا سکتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں "دین اور سیاست" میں کوئی تفریق نہیں تو اس کا عملی مفہوم یہی ہوتا ہے۔

دین (کتاب اللہ) کے اصول و احکام اور سیاست، انہیں نافذ کرنے کے طور طریقے۔

(۵) یہ طور طریقے، امت (بمعہ افرادِ مملکت) کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ اس مشورہ کیلئے، اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، کوئی سا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، چونکہ امت میں نہ کوئی سیاسی پارٹی ہوتی ہے نہ مذہبی فرقہ، اس لئے مجلسِ مشاورت کے اراکین کے انتخاب کا معیار، قرآنی نقطۂ نگاہ سے اہلیت اور صلاحیت ہوتا ہے اور بس۔

(۶) اس مجلسِ مشاورت (پارلیمان) میں نہ حزبِ اقتدار ہوتا ہے نہ حزبِ اختلاف۔ نہ ہی اس میں اقتدار کسی خاص طبقہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اقتدار (یعنی قوانینِ خداوندی کے نافذ کرنے کے اختیار) میں ساری امت برابر کی شریک ہوتی ہے اور برابر کی ذمہ دار۔ اور ان قوانین کا اطلاق بھی تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہوتا ہے —— تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے —— کا یہی عملی مفہوم ہے۔

اس پورے کے پورے نظام کو "الدین" یا آج کل کی اصطلاح میں "اسلامی نظامِ مملکت" کہا جائے گا۔ اگر اس کے مذکورہ بالا، اجزائے ترکیبی میں سے کسی ایک جزو کی بھی کمی ہو جائے گی، یا اس میں ردّ و بدل کیا جائے گا تو وہ نظام الدین یا اسلامی نہیں رہے گا۔ عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں، یہی نظام رائج تھا۔

آپ غور کیجئے کہ اس نظام اور مغرب کے جمہوری نظام میں کوئی بھی قدرِ مشترک ہے؟ قدرِ مشترک تو ایک طرف، یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

* * *

یہ نظام اسلام کے صدرِ اوّل میں رائج تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام باقی نہ رہا۔ بالفاظِ دیگر اُس وقت دنیا میں مسلمان تو رہے لیکن الدین نہ رہا۔ ایسے حالات میں، جو کچھ دین کے نام پر کیا جاتا ہے، اسے مذہب کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، صدرِ اول کے بعد، اسلام 'دین' کے بجائے 'مذہب' بن گیا۔ مذہب میں ہوا یہ کہ:-

(۱) عقائد، عبادات، شخصی قوانین الگ ہوگئے (انہیں مذہبی امور کہہ لیجئے) اور امورِ سیاست الگ۔ اس طرح دین اور سیاست میں ثنویت (دوئی) پیدا ہو گئی۔

(۲) مذہبی امور، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیئے گئے، اور امورِ سیاست، مملکت نے اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔ اس طرح اُمت میں دو "حکومتیں" قائم ہو گئیں۔

(۳) چونکہ مذہبی امور کے لئے کوئی مرکزیت (سنٹرل اتھارٹی) نہ تھی، اس لئے اُمت میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں ہر فرقہ کے عقائد اور عبادات بھی الگ الگ ہو گئے اور ضابطۂ شریعت بھی الگ الگ۔ (اسے فقہ کہا جاتا ہے)۔ چونکہ ہر فرقہ اپنے جداگانہ تشخص کو قائم رکھنا چاہتا تھا اس لئے مختلف فرقوں میں عصبیت اور کشیدگی کا پیدا ہونا اور برقرار رہنا لازمی تھا۔ اس کے لئے ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں پر کفر کے فتوے عائد کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں جس پر کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ نہ ہی کوئی فرقہ اپنے عقائد، مسلک اور فقہ میں ذرا سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تیار ہے —— تبدیلی پیدا کرنا تو ایک طرف، وہ ایسی بات سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں۔ وہ ایسی تبدیلی کو کفر اور ارتداد سمجھتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں سوچئے کہ مسلمانوں میں، مذہب کی موجودہ شکل (یعنی فرقوں کو) برقرار رکھتے ہوئے کسی طرح بھی الدّین کا نظام نافذ ہو سکتا ہے (جس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے)۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمارا موجودہ مذہب اور الدّین ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس میں مذہب اور سیاست کا الگ الگ رہنا ناگزیر ہے۔ ملوکیت میں یہی شکل تھی جس پر ہماری مذہبی پیشوائیت صدیوں تک مطمئن رہی۔ جب کسی بادشاہ نے مذہب کے دائرے میں قدم رکھنے کی کوشش کی، اس کے خلاف انہوں نے یہ کہہ کر احتجاج کیا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے لیکن بادشاہت (INSTITUTION OF KINGSHIP) کو کبھی خلافِ اسلام قرار نہیں دیا۔ ہمارے علمائے کرام، ان بادشاہوں کے درباروں میں ممتاز مناصب پر سرفراز رہے۔ بادشاہ 'امیرالمؤمنین ہوتا تھا اور یہ شیخ الاسلام۔

لیکن موجودہ زمانے میں ملوکیت کے خلاف لہر اٹھی تو اقوامِ مغرب کو خطرہ لاحق ہوا کہ مسلمانوں کو کہیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد نہ آجائے۔ اور یہ از سرِ نو الدّین کا نظام قائم کرنے کی طرف رُخ نہ کرلیں (جس میں انہیں اپنی موت نظر آتی تھی) انہوں نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ چونکہ اس نظام میں مذہب اور سیاست میں ثنویت (علیحدگی) بدستور قائم رہتی ہے اس لئے مسلم اقوام نے اسے لپک کر اپنا لیا۔ چنانچہ اب دنیا بھر کے مسلم ممالک میں یا ملوکیت کا نظام ہے اور یا مغربی نظامِ جمہوریت۔

ان حالات میں علامہ اقبالؒ کی منفرد آواز تھی جس نے مسلمانوں کو الدّین کے نظام کو دوبارہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے، اپنی بصیرتِ قرآنی سے، صدیوں کے بعد پہلی بار، مسلمانوں پر یہ حقیقت واشگاف کی کہ:

(۱) جس مسلک کو صدیوں سے اسلام سمجھا جا رہا ہے وہ الدّین نہیں۔ مذہب ہے۔
(۲) امتِ مسلمہ اگر اسلام کا احیاء چاہتی ہے تو اُسے مذہب چھوڑ کر الدّین اختیار کرنا ہوگا۔
(۳) مغربی جمہوریت خالصتہً ابلیسی نظام ہے جس میں غیر متبدل اقدارِ خداوندی کا تصور تک نہیں۔

الدّین اور مغربی نظامِ جمہوریت کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ کے الفاظ ہیں: ؎

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد — ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصرِ حاضر — کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد (ارمغانِ حجاز)

انہوں نے الدّین کا نظام قائم کرنے کے لئے، ایک خطۂ زمین کا مطالبہ کیا، جو آج پاکستان کی شکل میں دنیا کے جغرافیہ پر درخشاں ہے۔ انہوں نے محض سمجھانے کے لئے یہ کہا تھا کہ اس نظام میں "دین اور سیاست" پھر سے یکجا ہو جائیں گے، ورنہ، حقیقت یہ ہے کہ جب ہم الدّین کا نظام کہتے ہیں تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ اس نظام میں دین اور سیاست یکجا ہوں گے۔ انہوں نے اس عظیم حقیقت کو ایک مصرعہ میں اس جامعیت سے سمو دیا کہ انسان جوں جوں اس پر غور کرتا ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن نے کیا یہ تھا کہ —— از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد —— اس نے "دین کی چابی سے دنیا کا ہر تالا کھول دیا"۔ وہ اس باب میں اس حد تک گہرائی میں اترتے ہیں کہ، اپنے خطبات میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

> یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اسلام میں مذہب (چرچ) اور سیاست (مملکت) ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ نہیں۔ اسلام، ایک ناقابلِ تجزیہ وحدت ہے جسے مختلف گوشوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ۔ صفحہ ۱۴۶ - آکسفورڈ ایڈیشن ۱۹۳۴ء)

اس نظام کی تشکیل کے لئے انہوں نے کہا تھا کہ اس کے لئے شرطِ اوّلین یہ ہوگی کہ ملّتِ پاکستانیہ، قرآنِ خالص کو اپنی مملکت کے آئین اور ضابطۂ قوانین کی اساس قرار دے تاکہ مختلف فرقے اپنے جداگانہ تشخص کو ختم کر کے ملّت میں گم ہو جائیں اور اس طرح مذہب کی جگہ پھر سے دین لے لے۔

لیکن مذہبی پیشوائیت اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں مغرب کا جمہوری نظام ہی راس آتا تھا۔ چنانچہ یہ جو آپ پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہندوستان کے جید (نیشنلسٹ) علماء نے مطالبۂ پاکستان کی اس شدو مد سے مخالفت کی تھی، تو اس کی وجہ یہی تھی۔ ہندو کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" دے کر، ملک میں مغرب کا جمہوری نظام رائج کیا جائے۔ یہ اسکیم ہماری مذہبی پیشوائیت کی منشا کے عین مطابق تھی اس لئے ان علماءؑ نے اس کی تائید کی اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ان کے مفاد کا یہی تقاضا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، انہیں شکست ہوئی اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ ان علماء میں سے کچھ تو ہندوستان ہی میں رہ گئے اور باقی ادھر آ گئے۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ یہاں بھی وہی نظام رائج کیا جائے جسے یہ ہندوستان میں رائج کرنے کے حق میں کوشاں تھے۔ اور جو وہاں تقسیم کے بعد سے نافذ ہے۔ لیکن یہاں ان کی مشکل یہ تھی فضا میں اس اسلام (الدین) کا تصوّر پھیلا ہوا تھا جسے علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے عام کر کے، پاکستان حاصل کیا تھا۔ فضا میں پھیلا ہوا یہ تصوّر (مختلف سازشوں کی بنا پر) رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن طلوعِ اسلام کی کوشش یہ تھی کہ یہ چنگاری بجھنے نہ پائے۔ فریقِ مخالف طلوعِ اسلام کو اپنا حریف سمجھتا تھا اور اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے ان کی طرف سے طلوعِ اسلام کے خلاف جس قدر اور جس انداز سے پروپیگنڈہ ہوا (اور ہو رہا ہے) اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ طلوعِ اسلام اس آویزش میں بے سرو سامان ضرور تھا لیکن اس کی آواز حق پر مبنی تھی اس لئے یہ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

ہندوستان میں یہ علماء حضرات سیکولر نظامِ جمہوریت کی علانیہ تائید کرتے تھے۔ طلوعِ اسلام کی مسلسل پکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں یہاں برہنہ الفاظ میں ایسا کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں یہی کہا گیا کہ اگر اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تو یہاں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ اگر یہاں اسلامی نظام (یعنی الدین کا نظام) قائم ہو جائے تو جن مردانِ حق آگاہ کے ہاتھوں ایسا ہو، طلوعِ اسلام ان کی خاکِ پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے میں انتہائی فخر و سعادت سمجھے گا ——— یہ تو اگر خدا سے جینے کی دعا مانگتا ہے تو صرف وہ دن دیکھنے کے لئے ——— لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ رہا ہے کہ ان حضرات کے ہاتھوں الدین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ الدین کا نظام تو ایک طرف، ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہ مغرب کا جمہوری نظام بھی قائم نہیں کر سکیں گے۔ اس نکتہ کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ الدین میں تو خیر ساری اُمّت ہم آہنگ و یک رنگ ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت میں بھی برسرِ اقتدار آنے والی پارٹی میں فکر و نظر کی وحدت ہوتی ہے۔ یعنی ان کا سیاسی نصب العین ایک ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ صورت ہے کہ اسلامی نظام قائم کرنے کی مدعی، نو سیاسی پارٹیاں ہیں۔ اور ان میں کم از کم تین پارٹیاں ایسی ہیں جن کا تعلق مذہبی پیشوائیت سے ہے۔ یعنی جمعیت العلمائے اسلام۔ جمعیت علماء پاکستان اور جماعتِ اسلامی۔ جماعتِ اسلامی نے تو اپنے ساتھ علماء کے لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ باقی دو جماعتوں کی حالت یہ ہے کہ

ان کے علماء کی بھی ایک جماعت نہیں۔ ان کا ایک گروہ "علماءِ اسلام" ہے اور دوسرا "علماءِ پاکستان"؟۔۔۔۔ گویا نہ علماءِ پاکستان کا شمار علماءِ اسلام میں ہو سکتا ہے، اور نہ ہی علماءِ اسلام، علماءِ پاکستان قرار پا سکتے ہیں!۔۔۔۔ یا للعجب۔ ان تینوں پارٹیوں میں باہمدگر کس قدر اختلاف ہے، اس کا اندازہ ان فتووں سے لگ سکتا ہے، جو انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف لگا رکھے ہیں۔

ان فتووں کی زبان (حسبِ معمول) اس قدر نفرت انگیز اور تند و تیز ہے کہ ہم انہیں یہاں نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بس اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں کہ مفتی محمود صاحب (نام لے کر) مودودی صاحب کو کافر اور امریکہ کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کا تعلق دیوبندی فرقہ سے ہے اور (مولانا) شاہ احمد نورانی بریلوی فرقے سے وابستہ ہیں۔ یہ دونوں فرقے درشت ترین الفاظ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ مسلم لیگ والے، قائد اعظمؒ کے نام لیوا ہیں، لیکن باقی جماعتوں نے قائد اعظمؒ کو کافر اور مسلم لیگ میں شمولیت کو حرام قرار دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کے نمائندے ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے۔ آپ سوچیئے کہ جن حضرات کے اختلافات کا یہ عالم ہو ان میں کبھی ہم دلی اور یک رنگی پیدا ہو سکتی ہے؟ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس قسم کی ایک پارٹی بن سکتے ہیں جو (اسلام تو ایک طرف) مغربی نظامِ جمہوریت کی لاینفک شرط ہے؟ یعنی ایسی پارٹی جس کے ارکان میں وحدتِ فکر و نظر ہو۔

ان پارٹیوں کے عقائد کے اختلافات سے آگے بڑھ کر مبینہ اسلامی (یا نظامِ مصطفیٰؐ) کی عملی تشکیل کی طرف آیئے جس کے قیام کے یہ داعی ہیں۔ کسی نظام کا اوّلین تقاضا (بلکہ اس کے وجود کی وجہ جواز) مملکت کے لئے قانون سازی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، الدین کے نظام میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق مغرب کے جمہوری نظام میں ہوتی ہے۔ ان حضرات نے ابھی سے اعلان کر رکھا ہے کہ مختلف فرقوں کو اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوگی۔ کیا یہ وہی آزادی نہیں جو اس وقت بھارت نے وہاں کے مسلمانوں کو دے رکھی ہے؟ سوچیئے کہ اسے اسلامی نظام کہا جائے گا یا مغربی جمہوریت کا سیکولر نظام؟

اب پبلک لاز کی طرف آیئے۔ ان کے متعلق مودودی صاحب بہت عرصہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ:۔

> کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ، اہلِ حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔
>
> (ایشیا - ۲۳ر اگست ۱۹۷۶ء)

مودودی صاحب کے اس اعلان کے بعد آپ سوچیئے کہ ان حضرات کی طرف سے جو اٹھتے بیٹھتے کہا جاتا ہے کہ مملکت کے قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق بنائے جائیں گے، وہ کتنی بڑی مغالطہ آفرینی ہے! مودودی صاحب سے پوچھا گیا کہ جب کتاب و سنت کی رو سے کوئی متفقہ علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا تو پھر ملک میں پبلک لاز نافذ کونسے ہوں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ ملک کی اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے یہاں حنفی فقہ ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دی جائے گی! اس کے خلاف اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے جس قدر شدید احتجاج ہوا اسے ہم اس مقالہ میں بیان کر چکے ہیں جو طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۷ء میں "پاکستان میں اسلامی قانون کیسے بن سکے گا؟"

کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (یہ مقالہ الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا ہے)۔ اس احتجاج کے بعد اہلِ حدیث حضرات نے کہا کہ:۔

> ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتبِ فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں، جس مکتبِ فکر کو پسند کریں، اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کیلئے ایک مثال ہو کہ اس میں عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام - مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء)

"مثال" ہونے کی بابت تو ہم کہہ نہیں سکتے۔ البتہ یہ ملک اس اعتبار سے منفرد ضرور ہوگا کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ملے گا جس میں پبلک لاز کی یہ کیفیت ہو کہ اس میں مختلف ضوابطِ قانون رائج ہوں، اور ہر فرد کو آزادی حاصل ہو کہ وہ، جس قانون پر جی چاہے عمل کرے!

یہ تو اہلِ حدیث کا احتجاج تھا حنفی فقہ کے خلاف۔ قومی اتحاد میں، بریلوی اور دیوبندی دونوں فرقے شامل ہیں اور یہ دونوں حنفی فقہ کی پابندی کے مدعی ہیں۔ ان کے باہمی اختلاف کا یہ عالم ہے کہ جب مفتی محمود (دیوبندی) سرحد کے وزیراعلیٰ تھے تو بریلوی حضرات نے احتجاج کیا تھا کہ:۔

> مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلط کرنے کے لئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں۔
>
> (تنظیم اہلِ حدیث۔ ۱۳/۱۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۷۳ء)

نہیں! ایک قدم آگے بڑھیئے۔ مفتی محمود صاحب نے، اپنی وزارتِ علیا کے دوران ایک دفعہ کہا کہ وہ ایک آرڈی ننس جاری کر رہے ہیں جس کی رو سے حکومت نجی املاک اپنے قبضہ میں لے سکے گی۔ انہوں نے کہا کہ یہ فیصلہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے دو ہی تین دن بعد خود مفتی صاحب کی جمعیت علماء اسلام کی مجلسِ شوریٰ کا ایک اجلاس ہوا جس میں وہ بھی شریک تھے۔ اس مجلس میں یہ ریزولیشن پاس کیا گیا کہ اس قسم کا آرڈی ننس اسلام کے یکسر خلاف ہے۔ اسے واپس لیا جائے۔ چنانچہ وہ آرڈی ننس نافذ نہیں ہوا۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت نومبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۹)

* * *

یہاں تک بات سُنیوں کی ہو رہی تھی۔ مودودی صاحب کی اس تجویز کے خلاف (کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے) شیعہ حضرات کا ردِعمل اس مقالہ میں ملاحظہ فرمایئے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:۔

> اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی، تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی۔ (طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۷۷ء)

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب "اسلامی نظام" کے الفاظ عام تھے۔ اب جو ملک میں "نظامِ مصطفیٰ" کا نعرہ لگایا گیا ہے تو شیعہ حضرات نے اپنے موقف کو کھل بیان کر دیا ہے۔ لاہور سے ان حضرات کا ایک ماہوار مجلہ شائع ہوتا ہے۔ معارفِ اسلام! اس کے اگست ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے"

اس مقالہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ بھٹکا ہوا پاکستان "نظامِ خلافت" سے ہٹ کر "نظامِ مصطفٰےؐ" کی طرف پلٹا ہے۔ بلکہ لپکا ہے۔ الحریت فی الاسلام۔ مسئلہ خلافت، اور استخلاف فی الارض کی مغز تھکا دینے والی بحث و تکرار اب طاقِ نسیاں کی زینت بنا دی گئی ہے اور مملکتِ خداداد کے کونے کونے سے "نظامِ مصطفٰےؐ، نظامِ مصطفٰےؐ" کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ ہم اس تطہیرِ فکر کو پاکستان کے لئے نہایت مبارک سمجھتے ہیں۔

قیامِ نظامِ مصطفٰےؐ کے سلسلہ میں نظامِ خدا۔ نظامِ اسلام اور نظامِ قرآن جیسی غیر واضح اصطلاحیں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔ الفاظ کے پیچھے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حسبنا کتاب اللہ کی جگہ اب مسلمان کا دین حسبنا رسول اللہ کی طرف جا رہا ہے کہ وہی طٰہٰ و یٰسین بلکہ صاحبِ قرآن ہیں۔ اور ناطق قرآن ہیں۔ حضور (صلعم) مجسمہ قرآن ہیں۔ بی بی عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپ سرور (صلعم) کا خُلق ہی قرآن ہے۔ لہٰذا (BACK TO QURAN) کے بجائے (BACK TO MOHAMMAD) کا یہ نعرہ بڑا خوش آئند ہے۔ (ص۲۸)

مقالہ کے آخری حصہ میں کہا گیا ہے کہ:

یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں ہو سکتا کہ "اسلامی نظامِ حکومت" کا دستورِ اساسی قرآن ہی ہے۔ بے شک یہ قرآن حکیم ہے اور اللہ کی آخری کتاب ہے مگر اسے ملکوں کے دساتیر میں جگہ نہیں مل سکتی اس لئے یہ کسی سلطنت و مملکت و حکومت کا دستور یا آئین نہیں ہے۔ (ص۳۲)

اس مسلک کی رو سے اسلامی مملکتِ پاکستان میں، آئین و دستور سازی کے سلسلہ میں قرآن کو خارج کر دیا جائے گا۔ اور اس کی اساس "مصطفٰےؐ" کو قرار دیا جائے گا۔ اس سے مراد کیا ہے؟ اس کی وضاحت ملتان میں منعقد ہونے والی شیعہ کمیٹی کی ایک تقریب میں ان الفاظ میں کی گئی۔

قرآن و سنت کا مطالعہ اہلِ بیت کرام کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں کیا جائے کیونکہ ائمہ کرام کی سیرت، اسلام کی عملی شکل ہے ...... بارگاہِ خداوندی تک پہنچنے کے لئے مقامِ رسالت سے آگاہی ضروری ہے۔ مقامِ رسالت سے واقفیت کے لئے نکتہ ولایت اور مقامِ ولایت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور مقامِ ولایت کے تعین کے لئے شہادتِ عظمیٰ کی کسوٹی پہ پرکھا جا سکتا ہے۔

(امروز۔ مورخہ ۴ ۱۰/۷۷)

حال ہی میں علمائے شیعہ، پاکستان کی مجلسِ عمل کے ایک اجلاس میں، ایک ریزولیشن میں، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اپیل کی گئی ہے کہ:۔

اسلام کی روح اور سنت کے خلاف تمام قوانین کو منسوخ قرار دیا جائے۔ (پاکستان ٹائمز ۸ ۱۰/۷۷)

یعنی موجودہ آئینِ پاکستان میں کہا گیا ہے کہ "قرآن و سنت" کے خلاف تمام قوانین منسوخ کر دئے جائیں گے۔ لیکن مذکورہ بالا ریزولیشن میں "قرآن و سنت" کے بجائے "روحِ اسلام اور سنت" کہا گیا ہے۔ یہاں بھی قرآن

کو خارج کر دیا گیا ہے۔

* * *

مؤقر ماہنامہ معارفِ اسلام نے اکتوبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں، اپنے مطالبات کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اس میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ:-

> پاکستان ایک اسلامی مملکت تو ہے جس میں مسلمانوں کے سب فرق و مسالک کو نمائندگی ملنا چاہیئے۔ مگر اس کو حنفی سٹیٹ بنا دینا نظریۂ پاکستان کے بالکل خلاف ہے۔ (ص ۱۴)

مودودی صاحب نے "کتاب و سنت" کو ناممکن العمل قرار دے کر، فقہ حنفی تجویز کی تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثریت کا مسلک ہے۔ اس کی مخالفت اہلِ حدیث کی طرف سے بھی ہوئی تھی اور شیعہ حضرات کی طرف سے بھی۔ حنفی مسلک کی اکثریت دیوبندی ہے۔ اس کی مخالفت بریلوی مسلک سے وابستگان کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔ اب شیعہ حضرات نے کھلے کھلے الفاظ میں یہ کہہ دیا ہے:-

> اسلامی نظام کے داعیوں کی طرف سے بتکرار و اصرار کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے خلافتِ راشدہ ہمارے لئے ماڈل ہے۔

شیعہ حضرات اس کے لئے بھی مخالف ہیں۔ چنانچہ ماہنامہ معارفِ اسلام (مذکورہ بالا اقتباس کے تسلسل میں) لکھتا ہے:-

> پاکستان کا اسلامی دستور اور آئین یقیناً ایسا ہونا چاہیئے جو آئینِ مصطفویؐ ہو۔ جو نظام خدائم ہو۔ جو نظامِ مصطفےٰؐ ہو۔ اس کو نظامِ خلافت سے منطبق کرنے کی کوشش یقیناً فرقہ واریت کو بلاوا ہوگا کیونکہ آنحضرتؐ محمد مصطفےٰؐ کے کفن دفن کے وقت نظام خلافت کے لئے سقیفائی کارکردگی سے ہی تفریقِ امت میں پیدا ہوئی۔ عہدِ "خلافتِ راشدہ"، عہدِ ملوکیت بنی امیہ اور عہدِ بادشاہت بنی عباسیہ میں مسلمان فرقے فرقے ہوتے گئے۔ (ص ۱۴)

اس سے ظاہر ہے کہ جب شیعہ حضرات "نظامِ مصطفےٰؐ" کی تائید کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نظام میں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) نہ قرآن کو اساس قرار دیا جائے، اور نہ ہی خلافتِ راشدہ کو بطورِ ماڈل سامنے رکھا جائے۔

اس کے بعد معارفِ اسلام رقمطراز ہے:-

> شیعہ اثنا عشریہ مسلمانوں کے فرق و مسالک میں ایسا اہم اور وزنی فرقہ ہے جو سیاسیات ملکی میں حصہ لینے کو جزوِ مذہبی نہیں مانتا مگر جس کا اپنا الگ مدرسۂ تفسیر القرآن اور سلسلۂ حدیث ہے۔ جس کا اپنا الگ فقہ (فقہ جعفریہ) ہے۔ جو زندہ اجتہاد پر یقین رکھتا ہے۔ جن کے ہاں فقہی جمود آج تک طاری نہیں ہوا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کا اسلامی نظام اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک شیعہ پرسنل لاز (خصوصی قوانین) کو فقہ جعفریہ اور زندہ مجتہد جامع الشرائط اور مرجع الخلائق کے فتاویٰ کے مطابق نہ ڈھالا جائے۔ اور پبلک لاز (مشترکہ عوامی قوانین) میں بھی فقہ جعفریہ کو مساویانہ طور پر نہ رکھا جائے۔ (ص ۱۶)

شیعہ حضرات، کی تفسیر، حدیث اور فقہ ہی الگ نہیں۔ انہیں غیر شیعہ مسلمانوں سے ایک بنیادی اختلاف ہے اور وہی اختلاف درحقیقت، شیعہ اور غیر شیعہ میں نقطۂ امتیاز ہے۔ سنی مسلمان شورٰی کے قائل ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سربراہِ مملکت کا تقرر امت کے انتخاب کے ذریعے طے پاتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ سربراہ (امام) امت کا منتخب کردہ نہیں، بلکہ (نبی کی طرح) خدا کا مقرر کردہ، (مامور من اللہ) ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ خلافتِ راشدہ (بلکہ کسی بھی غیر شیعہ حکومت) کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ معارفِ اسلام اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۷ء میں لکھتا ہے:۔

> ......کوئی ہے ایسی آیت یا حدیثِ رسولؐ جس میں کہا گیا ہو کہ حاکم بنانا اللہ تعالٰے کے اختیار میں نہیں رہا بلکہ عامۃ المسلمین یا خاصۃ المسلمین انتخابی ادارہ قائم کر کے اپنی مرضی سے چن لیا کریں..... (ایسی حکومت کو ہم) خدا کی بادشاہت یا رسولؐ کی نیابت نہیں کہہ سکتے...... جمہوری حکومتیں۔ فوجی حکومتیں۔ آمر حکومتیں۔ اور بعد از رسولؐ ہونے کی وجہ سے "خلافتیں" یعنی انتظام ملکی کے لئے سیاسی حکومتیں۔ ان سب کو علماء دین تسلیم بھی کرتے رہے۔ بلکہ ائمہ اہلِ سنت ان سربراہان کو امیر المومنین اور علماء انہیں ظل اللہ تک کہتے رہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اسلامی یعنی قرآنی اصولوں کے مطابق منجانب اللہ قائم کی ہوئی حکومت، بالفاظِ دیگر "خلافت سید المرسلین" نہ تھی جو اپنی جگہ پر علیحدہ منجانب اللہ قائم تھی اور قائم ہے۔ (ص ۶)

اس کے بعد جریدۂ مذکور رقمطراز ہے:۔

> پس اہلِ اسلام کے دونوں فرقوں۔ یعنی شیعہ و غیر شیعہ میں متحد الخیال قائم کرنے کیلئے علاج تو یہی ہے کہ بعد از رسولؐ کی "پہلی خلافتوں" ــــ درحقیقت سیاسی حکومتوں ــــ کے لئے اعلان کر دیا جائے کہ یہ محض بعد از رسولؐ انتظام ملکی عمل میں لانے کے لئے صرف سیاسی حکومتیں تھیں۔ خلافت و نیابتِ نبوتِ ختمیہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

شیعہ فرقہ کا ایک دوسرا ترجمان ــــ ماہنامہ پیامِ عمل (لاہور) اس باب میں لکھتا ہے:۔

> لوگوں کے ایک گروہ کا یہ نظریہ ہے کہ امت کے عام لوگ، امت کے نیک اور صالحین میں سے کسی کو اس منصب (امامت یعنی حکومت) کے لئے انتخابات کر سکتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کی ریاست و حکومت اور مسلمانوں کے معاشرہ کا محافظ و نگہبان قرار دے سکتے ہیں لیکن ان کا یہ نظریہ اور ان کا یہ اصول تعلیماتِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی تصریحات کے بالکل خلاف اور برعکس تھا۔ اور ہے۔ (بابت جنوری۔ فروری ۱۹۷۵ء۔ ص ۲۳)

ان تصریحات سے آپ دیکھ لیجئے کہ اسلامی نظام اور قانون سازی کے بارے میں شیعہ حضرات کا مسلک کیا ہے۔ اور ان میں اور سنی مسلمانوں میں اختلافات کس قدر گہرے اور بنیادی ہیں۔

* * *

ہم نے اس موضوع پر ابھی تک مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات سے متعلق گفتگو کی ہے۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو کسی فرقہ سے متعلق نہیں قرار دیتے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:۔

> میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۵)

وہ اپنے مسلک کے متعلق کہتے ہیں:۔

> میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ دوم۔ ستمبر ۱۹۶۴ء ایڈیشن۔ صفحہ ۱۶۰)

انہوں نے ایک طرف یہ تجویز کیا کہ چونکہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے فقہ حنفی کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دینا چاہیئے۔ اور دوسری طرف اس فقہ کے متعلق فرمایا کہ:۔

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔
> (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ اور کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۷۴-۲۷۵)

حنفی مسلک کا مدار تقلیدِ ائمہ پر ہے۔ اسی وجہ سے وہ ان کی مدون کردہ فقہ کو غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:۔

> میرے نزدیک ایک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید، ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔
> (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۴۴)

مودودی صاحب کی تحریروں میں اس قسم کے اقوال بکثرت ملتے ہیں لیکن ہم، بغرضِ اختصار انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

* * *

ہم نہ شیعہ ہیں نہ سنی۔ نہ اہلِ حدیث ہیں نہ حنفی۔ نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی۔ نہ ہی ہمارا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے۔ اس لئے ہمیں ان اختلافی بحثوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن ہم اس مملکت کے باشندے ہیں اور اسی کے ساتھ ہماری اور ہماری نسلوں کی بقا وابستہ ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے مستقبل سے دلچسپی ضرور ہے ـــــ دلچسپی ہی نہیں۔ اس کا تحفظ اور بقا ہمارے نزدیک تقاضائے دین ہے۔ اس لئے ہم جب کسی ایسی تحریک یا حرکت کو دیکھتے ہیں جس سے اس کے مستقبل کو کوئی خطرہ لاحق نظر آتا ہو، تو قوم کو اس سے آگاہ اور متنبہ کرنا، ہم اپنا (ملی اور دینی) فریضہ سمجھتے ہیں۔ اسی فریضہ کا احساس ہے جو ہمیں بار بار ان موضوعات کو سامنے لانے پر مجبور کرتا ہے۔

اس وقت ساری قوم کی نگاہیں انتخابات پہ مرکوز ہیں اور مختلف پارٹیاں (اپنے اپنے مفاد کی خاطر) ان کی اہمیت کو اور بھی اجاگر کر رہی ہیں۔ لیکن انتخابات تو مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ مقصد ہے ان قوانین کی تدوین جن کے مطابق مملکت سرگرمِ عمل رہے گی۔ اب ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ مجلس قوانین ساز (لیجسلیٹو اسمبلی) کا اجلاس منعقد ہو رہا ہو جس میں پبلک لاز سے متعلق کسی اہم قانون کا بل زیرِ غور ہو۔ اسمبلی میں شیعہ۔ اہلِ حدیث۔ دیوبندی۔ بریلوی۔ جماعتِ اسلامی سے متعلق، اراکین اپنی اپنی فقہ لئے بیٹھے ہوں —— وہ فقہیں جن کے اختلافات کا اجمالی سا ذکر آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے اور جن میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ شریعت سمجھا جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس بل پر بحث و تمحیص کے دوران وہاں کس قسم کی سرپھٹول ہوگی، اور اگر اسے، جمہوری نظام کی رو سے، کثرتِ رائے سے پاس کر دیا گیا تو ملک میں اس کے خلاف کس قسم کی ایجی ٹیشن (بلکہ ایجی ٹیشنز) نہیں ہوں گی؟ اور اس کے بعد اس اسمبلی کا حشر کیا ہوگا جس نے اس قانون کو پاس کیا تھا —— اور یہ کچھ کسی ایک بل کے سلسلہ میں ہی نہیں ہوگا۔ ہر بل کے ضمن میں یہی کچھ ہوگا —— اور اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حکومت چلے گی کتنے دن؟

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ راز بھی آگیا ہوگا کہ یہ حضرات "نظامِ مصطفےٰ" کی وضاحت کیوں نہیں کرتے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اس میں قانون سازی کا طریق کیا ہوگا؟ اس ضمن میں جب خود جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے مودودی صاحب سے براہِ راست سوال کر دیا تو اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ قابلِ غور ہے:۔

> انہوں نے فرمایا کہ اسلامی نظام کی توضیح و تشریح کی بحث کا وقت ابھی نہیں ہے۔ یہ معاملہ وہی نمٹائیں گے جو اسمبلی میں اکثریت سے منتخب ہو کر جائیں گے۔ فی الحال یہ بات ضروری ہے کہ ۱۸؍ اکتوبر کو ملک میں انتخاب کا مرحلہ طے ہو جائے۔ .... پہلا مرحلہ ابھی انتخابات کا ہے۔ اس کے بعد ہی اسلام کی تشریح پر بڑی سنجیدگی سے غور ہوگا۔ اگر ہم ابھی سے اس مسئلے میں اُلجھ گئے تو اصل معاملہ پیچھے رہ جائے گا۔ (نوائے وقت ۱۳؍ ستمبر ۱۹۷۷ء)

مودودی صاحب (اور ان کے ہم نوا حضرات) کے نزدیک "اصل معاملہ" انتخابات کا ہے۔ اور ہمارے نزدیک اصل معاملہ اس مملکت کی سالمیت اور بقا کا ہے ؎

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

ان حضرات کے نزدیک "قومی اتحاد" انتخابات جیتنے کے لئے ہے۔ اور ہمارے نزدیک دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مملکت کے لئے قانون سازی کی وہ اساس اور بنیاد کیا ہے جس پر آپ متحد ہو سکیں گے؛ چونکہ اس مسئلہ پر ان میں سے دو پارٹیاں بھی متحد نہیں —— نہ ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دیں گے —— نہ دے سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ آج کا نہیں۔ بہت پرانا ہے۔ صدر ایوب (مرحوم) نے ۱۹۶۷ء میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:۔

اپوزیشن کے راہ نماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں، ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے —— جس طرح خدا اور رسولؐ کا منشا تھا، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے، اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی تصویب وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں، کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسے اسمبلی میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کر لیں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

لیکن اس پیشکش کو علماء میں سے کسی نے قبول نہ کیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس قسم کا ضابطۂ قوانین مرتب کر ہی نہیں سکتے جسے مختلف فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ بجائے اس کے کہ اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا، مودودی صاحب نے فرمایا کہ :-

> یہ شخص (صدر ایوب) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔
> (نوائے وقت ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

یہی وجہ ہے جو یہ حضرات اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیٰؐ کی وضاحت نہیں کرتے کیونکہ اس سے "اصل معاملہ" —— پیچھے جا پڑتا ہے —— لیکن اگر یہ حضرات برسرِ اقتدار آگئے تو پھر یہ اختلافات کس طرح چھپے رہ سکیں گے؟ یہ نکھر کر سامنے آئیں گے اور انہیں ساری دنیا دیکھے گی —— اس سے ان حضرات کا کیا بنے گا اور کیا بگڑے گا، اسے تو چھوڑیئے۔ اس سے ایک تو مملکت کی بنیادیں پھر متزلزل ہو جائیں گی اور دوسرے یہ کہ دنیا یہ نتیجہ اخذ کرے گی کہ اسلام کی بنیادوں پر کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ (معاذ اللہ) اب ایک "چلا ہوا کارتوس" ہے۔ "تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندو یہی کہہ کر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہم ملک کے باشعور طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی ان حقائق پر غور کیا ہے جو گذشتہ صفحات پر مذکور ہیں! اگر غور کیا ہے تو کیا اس کے بعد آپ پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے یا آپ نے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ یہ "مذہب" سے متعلق معاملات ہیں جن سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ "مذہب" سے متعلق معاملہ نہیں۔ یہ وہ معاملہ ہے جس کا اس ملک کے مستقبل کے ساتھ گہرا تعلق ہے جس سے اس کا استحکام اور سالمیت وابستہ ہے۔ اس لئے اس سے آپ کا لاتعلق ہو کر بیٹھ جانا، خودکشی کے مترادف ہے۔ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ کسی سے کوئی جھگڑا کریں۔ کسی قسم کی ایجی ٹیشن کریں۔ قطعاً نہیں۔ ہم صرف اتنا کہتے ہیں کہ آپ ان حضرات سے کہئے کہ وہ بتائیں کہ وہ بنیاد یا (BASIS) کیا ہو گی جس کے مطابق آپ ایسے پبلک لاز بنا سکیں گے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں! "کتاب و سنت" کے متعلق تو مودودی صاحب پہلے ہی کہہ چکے ہیں وہ اس کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد وہ بنیاد کونسی ہو گی!

جو شخص یا گروہ، ان حضرات سے اس بنیادی سوال کا مثبت اور واضح جواب لے لے گا، وہ قوم کا محسن تصوّر ہو گا۔ یاد رکھئے! ان فرقوں کی فقہیں بھی الگ الگ ہیں۔ ان کی حدیثیں بھی الگ الگ۔ لیکن امت میں قدرِ مشترک قرآن مجید ہے۔ جب تک قرآنِ کریم کو اساس قرار نہیں دیا جائے گا، اسلامی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔

معذرت

ہم نے ستمبر ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں اعلان کیا تھا کہ اکتوبر کا پرچہ شاید کچھ دنوں کی تاخیر سے شائع ہو کیونکہ ہمارا ارادہ تھا کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے انتخابی منشورات پر تبصرہ کیا جائے۔ ہم ان منشورات کا انتظار کرتے رہے لیکن انہوں نے نہ شائع ہونا تھا' نہ شائع ہوئے۔ اس انتظار میں وقت اتنا گذر گیا کہ اکتوبر کے پرچہ کی اشاعت کے لئے بہت زیادہ تاخیر ہوگئی۔ بنا بریں ہم نے مناسب سمجھا کہ اکتوبر، نومبر کا پرچہ شروع نومبر میں شائع کر دیا جائے (سو وہ اب حاضر ہے) اس فیصلہ کی اطلاع طلوعِ اسلام کی بزموں اور ایجنسیوں کو دے دی گئی تھی۔ لیکن انفرادی خریداران کو اطلاع دینے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی طرف سے رسالہ نہ پہنچنے کی شکایات کا تانتا بندھ گیا۔ ہم نے ان احباب کو فرداً فرداً اطلاع بھی دے دی تھی لیکن ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ احباب کو جو اس طرح زحمت کشِ انتظار ہونا پڑا اس کی معذرت پیش کی جائے۔ طلوعِ اسلام کی زندگی میں شاذ ہی ایسا ہوا ہو۔

احباب کو زحمت تو ضرور ہوئی لیکن ہمارے لئے اس "شر" میں بھی ایک "خیر" کا پہلو نکل آیا۔ رسالہ کی عدم وصولی کی شکایات جس کثرت سے موصول ہوئیں اور جس شدتِ اضطراب سے اس کمی کا مظاہرہ کیا گیا اس سے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ طلوعِ اسلام محض ایک ماہنامہ نہیں رہا۔ یہ قارئین کے لئے گویا جانِ مدعا بن گیا ہے جس سے محرومی ان کے لئے انتہائی قلق کا موجب ہوتی ہے۔ اس احساس پر ہم بدرگاہِ ربّ العزت سجدہ ریز ہیں کہ حلقہ طلوعِ اسلام کا ہمارے ساتھ اس قدر گہرا قلبی رشتہ پیوست ہو چکا ہے اور وہ ہماری اس سعیٔ ناتمام کو اس قدر گراں بہا خیال کرتے ہیں۔ ہم احباب کی اس تحسین کے لئے ان کے بدل شکر گذار ہیں۔

والسلام

ناظمِ ادارۂ طلوعِ اسلام۔ لاہور

ضرورتِ رشتہ

ایک معزز پاکستانی گھرانے کے بی۔ اے تک تعلیم یافتہ فرد (عمر تقریباً ۴۰ سال۔ غیر شادی شدہ) کے لئے جس کی ماہانہ آمدنی آٹھ سو روپے اور ملکیت میں ایک کشادہ مکان موجود ہے، ایک نیک سیرت دوشیزہ کا رشتہ مطلوب ہے۔ (خط و کتابت بصیغہ راز)

م۔ م۔ ی

معرفت ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

QURĀN—CLASSIFIED

تبویب القرآن

آپ نے لغات القرآن یا تفسیر القرآن جیسے الفاظ تو اکثر سنے ہونگے لیکن تبویب القرآن کے الفاظ آپکو نامانوس سے دکھائی دینگے۔ یا اس لئے کہ اس موضوع پر ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے حالانکہ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ تبویب کے معنی ہوتے ہیں باب باب کرنا۔ انگریزی زبان میں اسے (CLASSIFY) کرنا یا کسی کتاب کو (SUBJECT-WISE) مرتب کرنا کہا جاتا ہے۔ عام علمی کتابوں میں بھی اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس سے کتاب کے مندرجات کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن مجید جیسی عظیم اور محیط کل کتاب میں اس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ قرآن مجید میں خالق کائنات، خارجی کائنات، انسانی زندگی اور آخرت وغیرہ کے متعلق لاتعداد حقائق و معارف ہیں لیکن وہ کسی موضوع پر یکجا بیان نہیں کئے گئے۔ وہ پوری کتاب میں منتشر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور جب تک وہ سب کے سب یکجا نہ ہوں بات پورے طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ مثلاً آپ معلوم کرنا چاہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے، تو یہ موضوع "قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر نہیں ملیگا۔ اس کے مختلف اجزا تیس پاروں میں بکھرے ہوئے ملیں گے۔ ان تمام اجزا کو یکجا کرکے انہیں مربوط شکل میں مرتب کرنے سے یہ نظام اپنی مکمل شکل میں سامنے آئیگا۔ قرآنی مضامین کو اس طرح مرتب کرنے کو تبویب کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم لاتعداد عنوانات کو محیط ہے ان میں سے ہر عنوان کے متعلق یہ دیکھنا کہ اس کتاب عظیم میں کہاں کہاں کیا کیا کہا گیا ہے جس قدر محنت شاقہ چاہتا ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے عمر بھر کی خارہ شگافی اور دیدہ ریزی درکار ہوگی۔ یہ کچھ وہی کر سکتا ہے جسے خدا کی اس کتاب سے عشق ہو۔ ہمارا دور اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور موجود ہے جسے اس کتاب مبین سے ایسا ہی عشق ہے۔ اس مفکر دپرویز صاحب نے اپنی ساری زندگی اس کتاب کے حقائق و معارف کے افہام و تفہیم میں صرف کر دی ہے اور بلا مبالغہ،

کہا جا سکتا ہے کہ خالصتہً قرآن کے متعلق جس قدر وسیع اور عمیق کام اس ایک فرد نے تنہا کیا ہے، بہ حیثیتِ مجموعی اتنا کام کہیں اور نہیں ملتا۔ قرآنی حقائق سے متعلق ان کی دیگر متعدد بلند پایہ تصانیف تو ایک طرف، ان کی لغات القرآن، مفہوم القرآن اور مطالب الفرقان جیسی کتابوں کی مثال بھی کہیں نہیں ملے گی، اور ان سب کے بعد اب تبویب القرآن آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ان کی سالہا سال کی کاوشوں کے اس ماحصل کا تعارف اپنے الفاظ میں کرا دیں لیکن اس سوال پر بارِ دگر غور کرنے کے بعد یہ زیادہ مناسب نظر آیا کہ اس کا تعارف خود مصنف کی زبان سے کرایا جائے اور اس کے لئے اس دیباچہ سے زیادہ موزوں کوئی تعارف نہیں جس کے ساتھ انہوں نے تبویب القرآن کو پیش کیا ہے۔ یہ دیباچہ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آ جائیگا۔

ہم اس ضمن میں حسبِ ذیل تفصیلات ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) تبویب القرآن میں قریب دو ہزار چار سو اصلی اور ذیلی عنوانات کے حوالے آ گئے ہیں جنہیں آپ بآسانی مربوط شکل دے سکتے ہیں۔

(۲) اس کی بہ حیثیتِ مجموعی ضخامت ۱۵۱۲ صفحات ہے۔ اسے محض مطالعہ کی آسانی کی خاطر تین جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ورنہ ساری کتاب مسلسل ہے۔

(۳) کتاب اعلیٰ درجے کے سفید کاغذ پر، اوفسٹ میں چھاپی گئی ہے۔

(۴) اس کی جلد خوبصورت بھی ہے اور مضبوط بھی۔ تینوں جلدوں کو ایک بکس میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

(۵) تینوں جلدوں (مکمل تبویب القرآن) کی قیمت ایک سو ساٹھ روپے ہے۔ محصول ڈاک قریب چھ روپے اس کے علاوہ۔ چونکہ کتاب مسلسل ہے اس لئے اس کا مکمل سیٹ ہی مفید مطلب ہوگا اور مکمل سیٹ ہی سپلائی کیا جائے گا۔

ملنے کا پتہ:-

۱۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔ ۲۔ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

اس قسم کی ضخیم کتابیں محدود تعداد ہی میں چھپوائی جا سکتی ہیں۔ اس لئے اس کی جلد فرمائش بھیجنا آپ کے لئے مفید رہے گا۔

آپ کا خیر اندیش

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مراحلِ طلب و تجسّس

عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد
بر تلاشِ خود چہ می نازد، کہ رہ سوئے تو برد

وابستگانِ فکرِ قرآنی کی خدمت میں!

میری قرآنی فکر کے راستے کے متعدد سنگ ہائے میل سے آگے بڑھ کر آپ اس مقام پر پہنچ رہے ہیں جس کا برسوں سے انتظار تھا۔ لیکن اسے سامنے لانے سے پہلے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان مراحل کی بھی ایک جھلک دکھا دوں جن میں سے گزر کر میں اس محلِ لیلےٰ تک پہنچا ہوں۔ میں نے، اگرچہ، ان کا جستہ جستہ تذکرہ اس سے پہلے بھی ایک دو بار کیا ہے، لیکن زیرِ نظر تالیف چونکہ میری مدت العمر کی کاوشوں کا ماحصل ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ماہیت اور اہمیت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے، اس داستان کے اجزائے پریشان کو مربوط شکل میں پیشِ نظر رکھنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

میری پیدائش[1] ایسے ماحول میں ہوئی جس کی فضا شریعت اور طریقت، دونوں کی قدامت پرستی سے مہکتی۔ میرے دادا (چودھری، مولوی، حکیم) رحیم بخش (علیہ الرحمتہ) حنفی مسلک کے ایک جید عالم، چشتیہ نظامیہ خانوادۂ طریقت کے ممتاز اہلِ نظر اور اس کے ساتھ ایک حاذق طبیب بھی تھے۔ لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کو بھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ وہ اصلاح و خدمتِ خلق کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ مجھے اپنے علم اور سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے اسلئے

---

[1] میری پیدائش ۹ جولائی سنہ ۱۹۰۳ء کو ضلع گورداسپور کے مشہور قصبہ بٹالہ میں ہوئی (جو اب مشرقی پنجاب کا حصہ بن چکا ہے)۔ یہ قصبہ شدید مذہبی واقع ہوا تھا۔

انہی کے حسنِ آغوش میں میری تربیت اور انہی کے زیرِ نظر میری تعلیم ہوئی۔ فطرت کی کرم گستری سے میں نے ذہنِ رسا پایا تھا اس لئے چھوٹی سی عمر ہی میں علومِ شریعت کے مبادیات حاصل، اور جادۂ سلوک کی منازل طے کرلیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ فطرت، پھول کے ساتھ کانٹے بھی لگا رکھتی ہے، مبداءِ فیض نے جہاں مجھے اس قسم کی صلاحیتوں سے نوازا اور ایسے نادر اسباب سے متمتع ہونے کے مواقع فراہم کئے، میرے سینے میں تنقیدی کھٹک کا کانٹا بھی رکھ دیا جس کی وجہ سے میرا دل کسی بات کو، اپنا اطمینان کئے بغیر (آنکھیں بند کرکے) ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ میرے خارجی ماحول اور داخلی تقاضوں میں غیر محسوس طور پر کشمکش شروع ہوگئی۔ جو کچھ علومِ شریعت کے نام سے پڑھا یا جاتا تھا اس کے برحق ہونے کی سند یہ تھی کہ فلاں امام نے یوں فرمایا ہے اور فلاں کتاب میں یوں آیا ہے۔ یہ اسلاف کا مسلک ہے جس کا اتباع بلاچون وچرا کئے جانا چاہیئے یہی تقاضائے دین ہے۔ مسلکِ طریقت اس سے بھی زیادہ آگے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

اور میرا قلبِ متجسّس ہر دعوے کے لئے دلیل کا متقاضی تھا۔ یہ تھی وہ کشمکش جس کی آتشِ خاموش میرے سینے میں سلگ رہی تھی لیکن جسے میں زبان تک نہیں لا سکتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دادا جان (مرحوم) کا میرے دل میں بے حد احترام تھا۔ انہیں ان نظریات و معتقدات سے جس قدر گہری عقیدت تھی اور دوسری طرف، وہ میرے ساتھ جس قدر بلند توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے، مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ اگر انہیں میری اس کشمکش کا (علم تو ایک طرف) احساس بھی ہوگیا تو معلوم اس سے ان کے مقدس جذبات کو کس قدر شدید ٹھیس لگے۔ اس لئے اُس زمانے میں میں نے بڑے ضبط سے کام لیا اور انتہائی احتیاط برتی کہ لب کشائی تو ایک طرف، میری پیشانی کے شکن بھی کہیں اس کشمکش کے غماز نہ بن جائیں۔ اس کے بعد میں بسلسلۂ ملازمت لاہور آگیا تو سابقہ گھٹن کسی حد تک دور ہوگئی اور پھر جب دادا جان (مرحوم) کی وفات ہوگئی (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے) تو مجھے پوری آزادی سے غور و فکر کا موقعہ مل گیا۔ میں نے مروجہ اسلام کے نظریات، تصورات، معتقدات، رسوم و مناسک پر امکان بھر تحقیق کی جس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان کا بیشتر حصہ ہم نے دوسروں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ میں نے کئی برس تحقیق و کاوش کی ان سنگلاخ زمینوں اور خار وار وادیوں میں گزارے، اور اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اس صحرا نوردی اور دشت پیمائی میں میرے شکوک و شبہات بڑھتے چلے گئے اور سابقہ معتقدات و تصورات پر میرا یقین باقی نہ رہا۔ انہیں تو میں نے آسانی

سے جھٹک دیا تھا لیکن اس دستبرد میں ایک چیز ایسی تھی جس کی طرف، اس قسم کے شبہات ساتھ لے کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور وہ تھا قرآن کریم۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس قدامت پرستانہ انداز سے میں نے قرآن مجید پڑھا اور سمجھا تھا، اس کی رو سے (بہ صد ہزار بار توبہ) اسے خدا کی کتاب سمجھنا تو درکنار، کسی اچھے مصنف کی تصنیف تسلیم کرنا بھی دشوار تھا۔ لیکن، بایں ہمہ، میں اسے، دیگر معتقدات کی طرح، یونہی جھٹک نہیں دینا چاہتا تھا۔ اور اس کی خاص وجہ تھی۔ سیرت نبویؐ کے وسیع و عمیق مطالعہ کے بعد، حضورؐ کی ذات اقدس کے ساتھ مجھے علیٰ وجہ البصیرت والہانہ عقیدت حاصل ہو گئی تھی۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے عالم انسانیت میں ایسا تحیّر انگیز اور عدیم النظیر انقلاب برپا کر دیا تھا، نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہو سکتی ہے، اور نہ ہی (پناہ بخدا) فریب کار۔ اس لئے جب اس ذات گرامیؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری اور نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے، یہ خدا کا کلام ہے، تو مجھے توقف کرنا چاہیئے تاکہ اس کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق معلوم ہو جائے ــــ اور مبدا فیض کی کرم گستری سے یہ طریق جلد ہی سامنے آ گیا۔ اس طریق کے متعلق، فیضان اقبالؒ سے تین بنیادی نکات سمجھ میں آئے۔

(۱) قرآن کریم اپنے آپ کو نور (روشنی) کہتا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی خارجی ذریعہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خود دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام اشیاء کی اصل وحقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے۔

(۲) یہ عربی زبان میں نازل شدہ کتاب ہے اس لئے اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لئے "محاورہ عرب" کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور

(۳) اس نے کہا ہے کہ وہ "تصریف آیات" سے اپنے مطالب واضح کرتا ہے۔

"محاورہ عرب" سے مراد یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم میں جو الفاظ آتے ہیں، زمانۂ نزول قرآن میں عرب ان کا کیا مفہوم سمجھتے تھے۔ اس باب میں علامہ اقبالؒ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

> ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ میں ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ لکھتے ہیں۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔ ([illegible]) میں ایّام سے مراد تنزلات ہیں۔ یعنی فِیْ سِتَّةِ تنزلات ..... کم بخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان

میں "یوم" کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے۔ (اقبال نامہ - جلد اول ص ۱۴۳ تا ۱۴۴)

مصر کے شہرۂ آفاق عالم اور قرآن کریم کے ممتاز مفسّر، مفتی محمد عبدہٗ نے اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

> اس سلسلہ میں پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والے مفرد الفاظ کے حقیقی معنی سمجھے۔ یعنی یہ معلوم کرے کہ ان الفاظ کو اہلِ عرب کیونکر استعمال کرتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے قول و فہم پر بھروسہ نہ کرے، نہ اس پر اکتفا کرے۔ اس لئے کہ بہت سے الفاظ زمانۂ نزولِ قرآن میں کسی خاص مطلب و معنی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں، تھوڑا یا زیادہ عرصہ گزرنے پر، ان کے دوسرے معنی کئے جانے لگے۔ مثلاً لفظ "تاویل" ہے۔ جو تفسیر کے معنوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ دوسرے معنوں میں آیا ہے یعنی "انجام کار و عاقبت"۔ " قرآن کے وعدہ وعید کا نتیجہ ظاہر ہونا۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملّت میں بعد میں پیدا ہونے والی اصطلاحات کی تحقیق کرے، اور پھر ان میں اور قرآن میں آنے والے الفاظ میں فرق کرے۔ اکثر مفسّرین قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ اُن اصطلاحات کی رُو سے کرتے ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رائج ہو چکی تھیں۔ قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیں جو زمانۂ نزولِ قرآن میں لئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہتر طریق یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرّر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔ بعض اوقات وہ دیکھے گا کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "ہدایت" وغیرہ۔ ان مقامات پر غور و فکر سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔ قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کے لئے قانون یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ہوں۔ پورے موضوع و مطلب

سے اتفاق رکھتے ہوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

(مقدمہ تفسیر المنار)

لہٰذا، قرآن فہمی کے لئے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ازسرِ نو متعین کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مجھے کیا کیا دشواریاں پیش آئیں، ان کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں، نہ ہی ان کا تعلق تالیفِ زیرِ نظر سے ہے۔ مختصراً یہ کہ میں نے سالہا سال کی خارہ شگافی اور کوہ کنی کے بعد قرآن کریم کا مکمل لغت خود مرتب کیا (جو 'لغات القرآن' کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے)۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔

دوسرا مرحلہ 'تصریفِ آیات' کا تھا۔ قرآن کریم کا انداز عام انسانی تصانیف کا سا نہیں۔ انسانی تصانیف میں کتاب کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس موضوع سے متعلق جو کچھ کہنا ہو، اسے متعلقہ باب میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ اسلوب نہیں۔ اس میں ایک حقیقت اگر ایک مقام پر بیان کی گئی ہے تو اس کی مزید وضاحت یا تفصیل دوسرے مقام (یا مقامات) میں آئی ہے۔ ان میں اضافہ کہیں اور کیا گیا ہے، استثناء کہیں اور۔ پھر مختلف اہم حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے، انہیں سیاق و سباق کی روشنی میں، مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ یہ انداز کس قدر بلیغ اور حقائق کی وضاحت کے لئے کس قدر مؤثر ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ میں یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کا اسلوبِ بیان اس قسم کا ہے۔ اسے 'تصریفِ آیات' کہتے ہیں۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا۔ سورۃ انعام میں ہے۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۶/۱۰۵) "اس طرح ہم اپنے قوانین و حقائق کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے اور دہرا دہرا کر ان کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ یہ تسلیم کریں کہ تم نے انہیں نہایت واضح انداز سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس انداز سے بھی حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو علم و بصیرت سے کام لیں۔" اس آیت میں دَرَسْتَ کا لفظ تصریفِ آیات کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب گیہوں کی فصل پک جاتی ہے تو اسے کاٹ کر زمین پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر اس پر بیلوں کو مسلسل چلاتے رہتے ہیں تاکہ خوشوں سے دانے الگ ہو جائیں۔ اسے ہمارے ہاں "گاہنا" اور عربوں کے ہاں "درس" کہتے ہیں۔ لہٰذا درس کا مطلب یہ ہوگا کہ آیاتِ قرآنی کو اس طرح بار بار سامنے لایا جائے کہ ان کے الفاظ کے اندر چھپے ہوئے معانی نکھر کر الگ ہو جائیں۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ لفظ (تصریف) کس کس انداز سے آیا ہے اس کے لئے آپ (زیرِ نظر تالیف میں) درس یا تصریف کے عنوانات کے تابع حوالے دیکھئے۔

یہ تھا قرآن فہمی کا دوسرا مرحلہ!

لیکن جس طرح مجھے قرآنی الفاظ کے معانی متعین کرنے کے لئے کوئی مفید مطلب لغات میسر نہیں آئی تھی اور اپنا لغت مجھے خود مرتب کرنا پڑا تھا، اسی طرح مجھے کوئی ایسی کتاب نہ مل سکی جس میں قرآن کریم کو موضوعات یا مضامین کے اعتبار سے (SUBJECT - WISE) باب بہ باب (CLASSIFY) کیا گیا ہو (اسے اصطلاح میں تبویب کہتے ہیں)، جو دو ایک کتابیں اس موضوع پر ملیں ان کا انداز مختلف تھا۔ وہ یا تو زیادہ تر احکام سے متعلق تھیں یا ان میں قرآنی الفاظ کو حروف تہجی کی رو سے ترتیب دے دیا گیا تھا اور بس۔ قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک موضوع کو لیا جاتا اور یہ دیکھا جاتا کہ اس کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات میں کیا آیا ہے۔ بعض آیات میں اس کے متعلق براہ راست ذکر ہوگا اور بعض مقامات پر، مختلف آیات سے اس موضوع کو مستنبط کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہوگا کہ تبویب کرنے والے کی، سارے قرآن مجید پر اس طرح نگاہ ہو کہ اس کے سامنے بیک وقت وہ تمام مقامات آجائیں جن میں موضوع زیر نظر سے متعلق براہ راست کچھ کہا گیا ہے یا جن آیات سے وہ مفہوم مستنبط کیا جائے گا۔ یہ تھا تبویب (CLASSIFICATION) کا وہ طریق جس سے قرآنی مضامین سمجھ میں آسکتے تھے۔

لیکن اس انداز کی کوئی کتاب مجھے میسر نہ آسکی اور یہ کام بھی مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ جس طرح لغات مرتب کرنے کا منصوبہ مسلسل خارہ شگافی کا متقاضی تھا، اسی طرح اس انداز کی تبویب کے منصوبے کے لئے بھی اسی قسم کی کوہکنی مطلوب تھی۔ عام حالات میں میرے لئے اس کی ہمت کرنا، ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور تھا لیکن میں نے اس کا بھی بیڑا اٹھا لیا۔ مجھ میں اس کی ہمت کیسے پیدا ہوئی، اس کے لئے اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اسی یقین کا دوسرا نام عشق ہے اور عشق سے عزم میں ایسی پختگی اور ہمتوں میں ایسی بلندی پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہ کوئی مشکل مشکل رہتی ہے، نہ کوئی دشواری، دشواری۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کیا تھا اور اس مقصد کے ساتھ عشق تھا (اور اب تک ہے) جو مجھے اس قسم کی فرہادیت کے لئے بلا تأمل آمادہ کر دیتا تھا۔ چنانچہ میں نے بسم اللہ مجرىٰها و مرسٰها کہہ کر اس بحرِ ناپیدا کنار میں اپنا سفینۂ برگِ گل ٹھیل دیا۔ تھوڑے سے عرصہ کی محنت کے بعد اس کے ایسے خوشگوار نتائج سامنے آئے جن سے راستے آسان ہوتے اور منزلیں سمٹتی چلی گئیں۔

اس وقت تک میں یہ ساری کدوکاوش اپنی قرآن فہمی کے لئے کر رہا تھا لیکن آگے چل کر خود قرآن کریم سے یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ جو شخص قرآنی حقائق کو سمجھے اس پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ — دیکھا ہے جو کچھ اس نے اوروں کو بھی دکھلا دے۔

چنانچہ قریب دس سال کی محنت کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی جلد قوم کے سامنے پیش کر سکوں۔ قرآنی افہام و تفہیم کا یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا لیکن اس کے نتائج ایسے حوصلہ افزا تھے کہ ان سے میری ہمتیں بڑھتی چلی گئیں اور میں معارف القرآن کے سلسلہ کو اور آگے بڑھاتا گیا۔ چنانچہ (میری تصانیف) من و یزداں، جوئے نور برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، کتاب التقدیر وغیرہ اسی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جوں جوں میں اس راستے میں آگے بڑھتا گیا، قوم کے اربابِ فکر و نظر، بالخصوص نئی نسل کے خوش بخت تعلیم یافتہ طبقہ کی، قرآن کی طرف رغبت زیادہ ہوتی گئی ــ اور یہی میری کاوشوں کا مقصود اور میری محنتوں کا صلہ تھا۔ لیکن جوں جوں ان کے دل میں قرآنی حقائق کی طرف رغبت زیادہ ہوتی گئی، ان کے تقاضے بڑھتے گئے۔ ان کی طرف سے پہلا تقاضا یہ تھا کہ جس لغات کی رُو سے میں قرآنی آیات کا اس قدر بصیرت افروز مفہوم پیش کرتا ہوں وہ لغات بھی قوم کے سامنے آجانی چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں وہ لغات (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) چار ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر اربابِ ذوق کے لئے وجہِ فروغِ دیدہ اور باعثِ تسکینِ خاطر ہو گئی۔ جن اربابِ فکر و دانش نے اس کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے، ان کا تاثر یہ ہے کہ اس لغات کی موجودگی میں قرآن فہمی میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

لیکن اس سے قرآن کریم کو خود سمجھنا پڑتا تھا۔ اور یہ بڑی محنت اور کاوش چاہتا ہے جس کی اس زمانے میں، ہر ایک (بلکہ اکثریت) سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ان قرآنی احباب کی طرف سے اگلا تقاضا یہ پیش ہوا کہ لغات القرآن میں پیش کردہ مفاہیم کی روشنی میں پورے قرآن کریم (الحمد سے والناس تک) کا مفہوم بھی میں خود ہی مرتب کر دوں ــ اور میرے جنونِ عشق نے ان کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔ چنانچہ یہ مفہوم ــ مفہوم القرآن ــ کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہو گیا۔ واضح رہے کہ اس تمام عرصہ میں تبویبُ القرآن کے سلسلہ میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں جب ایک بار، پورے قرآن مجید کی تبویب سے (بزعمِ خویش) فارغ ہو جاتا تو نئے نئے عنوانات پھر ابھر کر سامنے آنے لگتے۔ اور اس طرح اس جوئے نور کی روانی میں از سرِ نو تحرک پیدا ہو جاتا۔ اس سے وہ حقیقت سمجھ میں آتی جسے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ (۱۸/۱۰۹) اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ علم خداوندی کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے (اور زمین کے تمام درخت قلمیں۔ ۳۱/۲۷) تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے لیکن میرے نشو و نما دینے والے کے قوانین و حقائق کی تفصیلات

ختم نہ ہوں خواہ اس کے ساتھ اس جیسے اور سمندر کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔" قوانینِ کائنات کی لامتناہیت کے متعلق علومِ کائنات کے ماہرین ہی کچھ کہہ سکتے ہیں اور وہ آئے دن اس کا اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں۔ علومِ قرآنی کی پہنائیوں کا یہ عالم ہے کہ اس باب میں بھی حرفِ آخر، دنیا کے آخری انسان کے لئے چھوڑنا پڑے گا۔ یہ اس لئے ..... کہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ...... (۴۱/۵۳)۔ "ہم نوعِ انسان کو انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعوےٰ مبنی بر حقیقت ہے۔" اب ظاہر ہے کہ عالم النفس و آفاق کے مستور حقائق تو حدود نا آشنا ہیں۔ علمِ انسانی جوں جوں وسیع، عمیق اور بلند ہوتا جائے گا، زمانے کی لہروں میں لپیٹے ہوئے حقائق بے نقاب ہوتے، اور اس طرح نت نئے عنوانات سامنے آتے جائیں گے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش — (جاوید نامہ)

اس طرح میرے زیرِ ترتیب تبویبُ القرآن میں نت نئے عنوانات کے اضافے ہوتے چلے گئے۔ اور چونکہ میں اسے کسی وقت بھی مکمل نہیں کہہ سکتا تھا اس لئے اس کی اشاعت کا وقت نہیں آتا تھا۔

لیکن تشنگانِ حقائقِ قرآنی کی بیتابیٔ تمنا اس کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو چیز قرآن فہمی کے سلسلہ میں بنیادی رہنمائی کی حیثیت رکھتی ہے، ہم اس سے کب تک محروم رہیں۔ یہ تو کبھی بھی تکمیل تک نہیں پہنچے گا۔ اس لئے جتنا کچھ اس وقت تک ہو چکا ہے، اسے بلا مزید تاخیر شائع کر دیا جائے۔ آئندہ اڈیشنوں میں اس میں اضافے ہوتے رہیں گے۔ ان کا تقاضائے شوق میری صبر طلبی پر غالب آ گیا اور میں (طوعاً و کرہاً) اس کے لئے آمادہ ہو گیا۔ مجھے اس کا بھی اندیشہ تھا کہ مسودہ کے ورق بوسیدہ اور فرسودہ ہو چکے ہیں، کہیں یہ ضائع ہی نہ ہو جائے۔ لہٰذا، یہ سعیٔ ناتمام پیشِ خدمتِ احباب ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ (۲/۱۸۶)۔ "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔" حضرات انبیاء کرامؑ کو بارگاہِ خداوندی سے ان کی پکار کا جواب کس طرح ملتا تھا، یہ تو ہم نہیں جانتے (نہ ہی کوئی غیر از نبی اسے جان سکتا ہے)، لیکن میں اتنا اپنے تجربہ کی بنا پر علیٰ وجہ البصیرت

کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ آپ انسانی زندگی کے کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ (PROBLEM) کے متعلق کلام اللہ (قرآن مجید) کے بابِ عالی پر دستک دیجئے، وہاں سے آپ کو جواب ملیگا۔ اور نہایت اطمینان بخش جواب۔ یہی سوالات ہیں جو زیرِ نظر تالیف میں عنوانات کی شکل میں آپ کے سامنے آئیں گے اور ان کے جوابات قرآنی آیات کے حوالوں کی صورت میں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ان سوالات میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور ان کے جوابات میں بھی۔ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے (ضربِ کلیم)

(۰)

اس مقام پر یہ سوال سامنے آئے گا کہ میں جو کم و بیش گذشتہ چالیس سال سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس قدر تن دہی اور جانفشانی سے مصروفِ تگ و تاز ہوں تو اس سے مقصد کیا، یا کم از کم فائدہ کیا ہے؟ میں اس سوال کا جواب نہایت مختصر الفاظ میں پیش خدمت کرتا ہوں۔ قرآنِ مجید میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ تم اس (کتاب) میں غور و فکر کرو۔ اس سے اس کے حقائق تمہاری سمجھ میں آجائیں گے۔ قرآنِ کریم میں غور و تدبر کا حکم نہ تو خاص افراد کے لئے ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے سے مختص۔ یہ کتابِ عظیم تمام انسانوں کے لیے، قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس پر غور و فکر کرنا، اس پر ایمان رکھنے والوں کا فریضہ ہے۔ ہمارے ہاں کے عوام، محض ثواب کی خاطر، بلا سمجھے اس کی تلاوت کر لیتے ہیں۔ لہٰذا غور و تدبر کے لحاظ سے وہ مرفوع القلم ہیں۔ مذہب پرست طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس پر جس قدر غور و تدبر کیا جانا تھا، کیا جا چکا ہے اور اس کا ماحصل ہمارے اسلاف کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ ہمارا کام ان کتابوں کا پڑھ لینا ہے اور بس۔ لہٰذا غور و تدبر ان کے ہاں شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتا ہے۔ جو اربابِ دانش و بینش، غور و تدبر کے اہل ہیں، ان کے سامنے جس شکل میں قرآنِ کریم پیش کیا جاتا ہے وہ اس میں کچھ کشش محسوس نہیں کرتے۔ میرا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ میں نے ان کے سامنے قرآنِ کریم کو، علومِ حاضرہ کی روشنی میں، دلائل و بصیرت کی رُو سے اس طرح پیش کیا کہ وہ اس میں کشش محسوس کرنے لگ گئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں اس کے حقائق پر غور و فکر کی دعوت دی تو محسوس کیا کہ وہ 'با وصفِ خواہشِ بسیار' اس کے لئے نہ اتنا وقت دے سکتے ہیں، نہ اتنی محنت کر سکتے جو اس فکر و تدبر کے لئے لاینفک ہے۔ علامہ اقبالؒ نے (اپنے خطبات میں) کہا ہے کہ وحیِ خداوندی انسان کی محنت میں بچت کر دیتی ہے۔ عقل اپنے تجرباتی طریق کی رُو سے

جس مسئلہ کے حل کی تلاش میں صدیوں مصروفِ دشت پیمائی رہتی ہے، وحیِ خداوندی اس کا حل پہلے ہی دن پیش کر دیتی اور اس طرح انسانی وقت، توانائی اور محنت بچا دیتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا مقصد، قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والے اربابِ علم و دانش کے وقت، توانائی اور محنت میں بچت کرنا ہے۔ میری لغات القرآن، مفہوم القرآن، اور اب تبویب القرآن اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ میں نے عمر بھر کی خارہ شگافی اور سنگ تراشی سے ان حضرات کے تدبر فی القرآن کی راہوں کو ہموار کر دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، تدبّر فی القرآن کا حکم اور تاکید ہر ایک کے لئے ہے اس لئے میرا یا کسی اور کے تدبّر کا ماحصل، کسی دوسرے کے لئے نہ سند قرار پا سکتا ہے نہ حجت۔ میری تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے، اس پر غور و فکر کریں اور اس کے حقائق و معارف کو از خود سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ اس دور میں، اس بات کی توقع ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سرچشمۂ آبِ بقا تک پہنچنے کے لئے ساری عمر مصروفِ بادیہ پیمائی رہے۔ اس سے اکثر احباب مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ تم نے تنہا یہ سب کچھ کیسے کر لیا؟ ان کا یہ سوال جتنا ان کیلئے تعجب انگیز ہے، اس سے کہیں زیادہ خود میرے لئے حیرت خیز۔ میں یہ تو بتا سکتا ہوں کہ میں نے کیا کچھ کیا ہے، لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ میں نے یہ کیسے کر لیا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے میری عمر کا ابتدائی دور، قدامت پرستانہ علوم کی تحصیل اور اس کے ساتھ تصوف کی عملی ریاضتوں میں گزرا۔ (وقت کے علاوہ، میری صحت بھی انہی کی نذر ہو گئی تھی)۔ اس کے بعد وادیِ تشکیک میں اترا تو حتی المقدور، دنیا بھر کے علوم و فنون کا مطالعہ کیا۔ (اس کی کچھ جھلک میری تصنیف "انسان نے کیا سوچا؟" میں نظر آ سکے گی)۔ پھر قلم اٹھایا تو گزشتہ چالیس پچاس برس میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب اسے ہاتھ سے چھوڑا ہو۔ اس کے ساتھ، مطالعہ بدستور جاری رہا۔ قریب تیس برس تک سرکاری ملازمت کی اور گھر بار کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام جاری ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس تحریک کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں سب پر مستزاد۔ قریب پچیس سال سے ہفتہ وار درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مختلف گوشوں سے آمدہ استفسارات کے جوابات۔ جن مفاد پرست گروہوں پر قرآن کی آواز گراں گزرتی ہے کیونکہ اس کے عام ہو جانے سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے، ان کی طرف سے بے پناہ مخالفت کی مدافعت۔ یہ سب کچھ شکستہ صحت اور بے سر و سامانی کے ساتھ، کسی فکری معاونت یا مالی سہاروں کے بغیر، تنہا! ان حالات میں آپ سوچئے کہ پوچھنے والے یہ پوچھنے میں کس قدر حق بجانب ہیں کہ تم نے یہ سب کچھ کیسے کر لیا، اور میں ان کے

استفسار کے جواب میں کیوں تصویرِ حیرت ہوں!؛ میں اگر کچھ کہہ سکتا ہوں تو صرف اتنا (جسے پہلے بھی کہہ چکا ہوں) کہ مقصد کے ساتھ عشق ہو تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنی مضمر توانائیوں کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ تو ـــ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا ـــ واقع ہوا ہے۔ عشق کی اذانِ سحر اس کی مضمر صلاحیتوں کو خواب سے بیدار کر دیتی ہے۔

میں اپنے متعلق کچھ کہتے ہوئے بڑی جھجک محسوس کیا کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں نے آج کی نشست میں اتنا کچھ اس لئے کہہ دیا ہے کہ جو اربابِ شوق تدبر فی القرآن کی آرزو رکھتے ہوں، دوں ہمتی اور کم فرصتی کا احساس ان کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ میں کوئی فوق البشر انسان نہیں، انہی جیسا ایک فرد ہوں۔ اس لئے اگر میں اس عمر رسانی اور اس قدر مصروفیات کے باوجود، اتنا کچھ کر سکتا ہوں، اور اس سن رسیدگی میں بھی (جبکہ میرا رہوارِ عمر، زندگی کی چوہتر ـ ۷۴ ـ منزلیں طے کر چکا ہے) اسی جذب و شوق کے ساتھ مصروفِ کار ہوں، تو وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ اور وہ تو مجھ سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ میں نے جب اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھا تھا تو مجھے کوئی نقشِ پا تک ایسا نظر نہیں آتا تھا جو میرے لئے دلیلِ راہ بن سکتا۔ لیکن میں نے ان کے لئے راستے بڑے ہموار کر دئے ہیں۔

دعا دیں گے مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آتے ہیں میرے ساتھ منزل کے

میں عمر بھر کی محنت و کاوش کے بعد جس مقام پر اپنے سفر کو ختم کروں گا، وہ ان کی جادہ پیمائی کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ اگر میرے ساتھ یا میرے بعد کوئی بھی اس راستے پر چل نکلا تو یہ میری محنتوں کا کافی صلہ ہوگا۔ یہی میری تمنا ہے اور اقبالؒ کی ہمنوائی میں یہی آرزو کہ؛

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　　میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　　میری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں میری، آرزوئیں میری　　　امیدیں میری، جستجوئیں میری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
میرے قافلے میں لٹا دے اِسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اِسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم

اور آخر میں کچھ تبویب القرآن کی ترتیب کے متعلق:

۱۔ یہ کتاب قرآنی الفاظ کا انڈکس نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ اس میں (مثلاً) یہ بتایا گیا ہو کہ قرآن کریم میں "اللہ" کا لفظ کس کس آیت میں آیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں پہلے سے موجود ہیں۔ یہ قرآنی مضامین (موضوعات) کا تعارفی انڈکس، (یا دائرۃ المعارف) ہے۔ اس میں (مثلاً) یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم نے معاشی نظام کے متعلق کیا اور کہاں کہاں کچھ کہا ہے۔

۲۔ اس میں آیات کے صرف حوالے دیئے گئے ہیں، آیات درج نہیں کی گئیں۔ اگر آیات بھی درج کی جاتیں تو معلوم اس کی ضخامت کس قدر بڑھ جاتی۔ قرآن مجید کے نسخے ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں، تبویب القرآن کے حوالوں کے مطابق آیات ان نسخوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ آیات کے ترجمے تو قرآن مجید کے مترجم نسخوں میں مل جائیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کا مفہوم سمجھنا چاہیں تو اس کے لئے میرے "مفہوم القرآن" کو سامنے رکھیئے۔

۳۔ تبویب القرآن کی افادیت، حوالوں کی صحت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان حوالوں کے چیک کرنے میں امکان بھر کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے شماروں (نمبروں) میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی آیت، تبویب میں درج شدہ حوالہ کے مطابق نہ مل سکے، تو ایک آدھ آیت پہلے یا بعد میں دیکھ لیں۔ لیکن اگر اس کے باوجود مطلوبہ آیت نہ ملے تو وہ تبویب میں سہوِ کتابت ہو گا۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس قسم کے سہو سے مجھے مطلع فرمائیں گے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ آیات کے حوالے اس طرح دیئے گئے ہیں (۲:۴۰) اس کا مطلب ہے، دوسری سورۃ (البقرہ) کی چالیسویں آیت۔

۴۔ بعض آیات، ایک ہی عنوان میں ایک سے زیادہ مرتبہ آگئی ہیں۔ ایسا ناگزیر تھا۔

۵۔ جو بات قرآن میں نہیں لیکن ہمارے ہاں اسلام کے نام سے مروج ہے، اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم میں نہیں۔

۶۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے کسی آیت کو ایک خاص عنوان کے تحت لکھا ہو اور آپ کے خیال میں اُسے کسی دوسرے عنوان کے تابع ہونا چاہیئے تو یہ کوئی ایسا اہم اختلاف نہیں۔ آپ اپنے نسخہ میں اس آیت کو اس عنوان کے تابع درج کر لیں۔

۷۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم کی تبویب کی کسی کوشش کو بھی حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسا اہم موضوع آئے جو تبویب القرآن کے موجودہ ایڈیشن میں نہ آسکا ہو تو اس سے مجھے مطلع فرمایئے۔ معلوم، اس کے بعد، خود میرے ذہن میں بھی کتنے موضوعات مزید آئیں گے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

۸۔ سب سے اہم، تبویب القرآن کا انڈکس ہے۔ تبویب القرآن پورے کا پورا، ایک مسلسل تالیف ہے جسے محض بغرضِ سہولت، تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ایک ہی کتاب ہے، اس لئے اس کے صفحات مسلسل ہیں اور تینوں جلدوں کا انڈکس ایک ہی ہے جسے بتمام و کمال اسی جلد میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

(۱) تبویب میں تمام موضوعات (عنوانات) حروفِ تہجی (ا۔ ب۔ ت) کے لحاظ سے ترتیب وار دیئے گئے ہیں۔ انڈکس میں یہ عنوانات جلی قلم سے لکھے گئے ہیں اور ان کے سامنے صفحہ کا نمبر دیا گیا ہے۔ صفحات تینوں جلدوں کے مسلسل ہیں۔

(ب) ایک (جلی) عنوان کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات بھی آ گئے ہیں۔ ان ذیلی عنوانات کو بھی انڈکس میں حروفِ تہجی کے لحاظ سے، نسبتاً خفی قلم سے لکھا گیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ہر ذیلی عنوان کے آگے قوسین (بریکٹ) کے اندر وہ عنوان لکھ دیا گیا ہے جس کے تحت وہ ذیلی عنوان ملیگا۔ اس کے سامنے بھی صفحہ کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ ذیل کی مثال سے یہ اشارات بآسانی سمجھ میں آجائینگے۔

آخرت صفحہ ۲

آخرت۔ (ساعت) ″ ۸۶۴
آخرت کا ثواب (ثواب) ″ ۵۴۶
آخرت کی زندگی (زراعت) ″ ۸۴۲

(۰)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، لغات القرآن، مفہوم القرآن، تبویب القرآن (اور میری دیگر تصانیف) تدبر فی القرآن کے راستے میں آسانیاں پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ میں یوں تو لغات اور مفہوم کی اشاعت کے بعد مطمئن ہو گیا تھا کہ یہ اس مقصد کے حصول کے لئے کافی ہیں لیکن تبویب القرآن کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی قرار پا جائیگی۔ لیکن میرے قرآنی احباب کی تو کیفیت ہی کچھ اور ہے۔ ان کی طرف سے میری ہر کوشش کے بعد ایک نیا تقاضا پیش کر دیا جاتا ہے ـــ اور سچ پوچھئے تو مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے کیونکہ تقاضا تو کسی مقصد کے ساتھ قلبی وابستگی کا مظہر ہوتا ہے۔ ابھی تبویب القرآن کی اشاعت کے پروگرام پر غور ہو رہا تھا کہ یہ تقاضا پیش کر دیا گیا کہ اب مجھے قرآن کریم کی پوری تفسیر بھی مرتب کر دینی چاہیئے۔ ہر چند عمر کے اس مرحلہ میں، اس قدر طویل سفر کا عزم بڑا ہمت طلب تھا لیکن میں نے احباب کی شدتِ شوق (اور خود اپنے اس "لالچ" کی تسکین کی خاطر کہ اس سے شاید کچھ اور

قلوب میں قرآن مجید کی کشش پیدا ہو جائے — کہتے ہیں ناں کہ بڑھاپے میں انسان زیادہ حریص ہو جاتا ہے، اسے بھی قبول کر لیا، اور مطالبُ الفرقان کے نام سے تفسیر القرآن بالقرآن کے سلسلہ کا آغاز کر دیا۔ اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور تیسری زیرِ تسوید ہے۔ میری تو ساری زندگی اس اجمال کی تفصیل ہے کہ:

غروبِ شمس، نویدِ طلوعِ صبحِ دگر

اور کس قدر خوش بخت ہے وہ انسان جس کی ہر شام، صبحِ دگر کی نویدِ جانفزا ہو۔ اسی لئے میں احباب کے ہر نئے تقاضا پر مسکرا کر کہہ دیا کرتا ہوں کہ — سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی۔

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے   تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

(۰)

اور آخر میں، جھکی ہوئی نگاہوں سے، وہ اعتراف جس پر میں اپنی ہر فکری تخلیق کو ختم کیا کرتا ہوں۔ میں نے فکرِ قرآنی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو و خطا سے منزّہ کہا جا سکتا ہے، نہ حرفِ آخر۔ اس میں جو کچھ صحیح ہے وہ صدقہ ہے خدا کی اس کتابِ عظیم کا جس میں حق و صداقت کے سوا کچھ نہیں اور جو سہو ہے وہ نتیجہ ہے میری کوتاہیٔ فہم کا:

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے!

اس سہو و خطا کے لئے میں، اس درخواست کے ساتھ بحضورِ ربّ العزت خواستگارِ عفو ہوں کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اس کے برعکس

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا   آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

وَالسّلام
پرویز
۲۵/بی گلبرگ۲ - لاہور

ستمبر ۱۹۷۷ء

(۰)

باسمہٖ تعالےٰ

بہ سلسلہ قرآنی نظام

خُدا کی گرفت

(اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی گرفت

آجکل یہ فقرہ زبان زد خلائق ہے کہ پاکستان کے لئے سنہ ۱۹۷۷ء (کا سال) بڑا منحوس ثابت ہوا ہے۔ ہم تو "سعد و نحس" کے قائل نہیں۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نے ان لوگوں سے، جو سمجھتے تھے کہ نحوست کہیں خارج سے آتی ہے، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ۔ (۳۶/۱۹) نحوست کہیں باہر سے نہیں آیا کرتی۔ وہ تو تمہارے ساتھ چپکی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ۔ (۴۲/۳۰) جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ تمہارے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہیں خارج سے تم پر وارد نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا ہم نہ تو "گردشِ افلاک" کو مطعون کر سکتے ہیں، نہ "قسمت کے لکھے" کی خود فریبی سے، اپنی خطاکوشیوں کے نتائج کو اربابِ قضا و قدر کے سر تھوپ کر، بری الذمہ ہو سکتے۔ لیکن اگر "نحوست" کی توہم پرستی سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ جس قسم کی پریشانیوں میں ملک اس سال گرفتار ہوا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ امسال شروع جنوری میں، مارچ میں انتخابات منعقد کرنے کا فیصلہ اور اعلان ہوا تو ملک میں انتخابی سرگرمیوں کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ خدا خدا کر کے انتخابات منعقد ہوئے تو انتخابات میں بدعنوانیوں کے الزامات کے سلسلہ میں ہنگامی تحریک شروع ہو گئی جس سے سارا ملک فسادات کی شعلہ باریوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ قریب چار ماہ تک ملک گیر تباہیوں اور بربادیوں کا یہ جنون عام رہا تو (۵) جولائی کو مارشل لاء لگ گیا۔ (۱۸) اکتوبر نئے انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی۔ عید کے فوری بعد (۱۷ ستمبر سے) انتخابی سرگرمیوں کی اجازت ملی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد (شروع اکتوبر میں) انتخابات غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کر دینے کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت مسٹر بھٹو، اور ان کی (پیپلز) پارٹی کے (سابقہ) برسرِ اقتدار "با ذمہ دار" افراد میں سے بعض کے خلاف۔ عدالتوں میں مقدمات دائر ہیں۔ اکثر کے خلاف تحقیق و تفتیش کا عمل جاری ہے۔ چونکہ مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے سارا ملک عجیب قسم کی سراسیمگی اور حزن کی گرفت میں آیا ہوا ہے ——— وہ حزن جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وجہ کچھ معلوم نہیں ——— مگر دل

ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ کسی زمانے میں اسے محض شاعرانہ یاس انگیزی سے تعبیر کیا کرتے تھے جو کہتا تھا کہ: ؎

ہے کوئی بات آج ہونے کو   جی بہت چاہتا ہے رونے کو

آج یہ "شاعری" حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خطۂ پاک کو ہر طرح کے خارجی اور داخلی خطرات سے محفوظ رکھے، کہ اس کی حفاظت کے ساتھ ہماری ہر متاعِ حیات کی حفاظت وابستہ ہے۔

ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ جذباتی قوم جب اس قسم کے غیر معمولی حادثات سے دوچار ہو جو ان دنوں یہاں رونما ہو رہے ہیں تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے، حالانکہ ایسے حالات میں ہوش و حواس کو اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حواس باختگی کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط اور صحیح میں امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال پر غور کیجئے۔ قرآن کریم نے "تلقین اور تاکید کی ہے کہ اگر کسی کے خلاف کوئی الزام عائد ہو تو ملزم کے متعلق حسنِ ظن سے کام لو۔ اور جب تک وہ الزام ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہ تصور کرو۔ اس نے الزام اور جرم یا ملزم اور مجرم میں اس فرق پر اس قدر زور دیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب کسی کے خلاف کوئی الزام عائد ہو تو تمہارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ:

هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲)   وَهٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)

ہو سکتا ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہو، یونہی بہتان ہو۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی بات سنی اسے لے اڑے۔ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اور بلا علم و تحقیق افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔ وہ کہتا ہے کہ: تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا۔ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۵) حالانکہ عدالتِ خداوندی میں یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ ملزم کو مجرم مشہور کر دینے سے، اس شخص کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے، قطع نظر اس کے، اس قسم کے معاشرہ کے متعلق کیا "تاثرِ عام" ہوتا ہے اس پر غور فرمائیے۔ پچھلے دنوں، الزامات کو جرائم قرار دے کر ان کے متعلق جس شدت اور وسعت سے شور مچایا گیا اس سے بیرونی ممالک میں یہ "تاثر" پیدا ہو رہا ہے گویا یہ ساری قوم مجرموں سے بھری پڑی ہے۔ لوگوں نے اتنا بھی ضبط نہیں کیا کہ جو مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں، ان کے متعلق عدالتوں کے فیصلہ کا تو انتظار کر لیا جائے اور اس کے بعد مجرم اسے سمجھا جائے جسے عدالت مجرم قرار دیدے۔ ملک کے رائج الوقت قانون کی رو سے بھی زیرِ سماعت مقدمات کے متعلق رائے زنی کرنا ممنوع ہے۔ لیکن یہاں اس قانون کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ اس کے برعکس، یہاں اس قسم کے افسانے تراشے گئے کہ الامان والحفیظ۔ اور پھر افسانے تراشنے والے انہیں اس حتم و یقین کے ساتھ بیان کرتے تھے گویا یہ اس جرم کے ارتکاب کے عینی شاہد ہوں۔ یہ کچھ، افراد تک محدود نہیں رہا۔ اخبارات ان سے بھی دس قدم آگے بڑھ گئے —— ایسا نظر آتا تھا گویا ان اخباروں نے باہمی ریس (RACE) لگا رکھی ہے کہ کون زیادہ سنسنی خیز" افسانے چھاپتا ہے۔ جس طرح چوران بیچنے والے کی بِکری کا راز اس میں ہوتا ہے کہ وہ کتنے تیز اور زیادہ مسالے ڈالتا ہے" اس طرح ان اخباروں کی کمائی کا راز اس میں تھا کہ کون زیادہ کیچڑ اچھالتا ہے۔ معاشرہ اس قسم کی "ہولی" کھیلنے میں مصروف تھا اور ہم انگشت بدنداں کہ

بار الٰہا! کیا یہ وہی قوم ہے جس نے ابھی ابھی پورا مہینہ قرآن سنا، اور ایک ایک رات میں اسے ختم کیا ہے؛ کیا قرآن پڑھنے اور سننے والی قوم کا کردار ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تیرے جس رسول کے پاک نام (صلے اللہ علیہ وسلم) پر یہ اپنا نظام قائم کرنے کی مدعی ہے، کیا اس رسولؐ نے انہیں یہی تعلیم دی تھی!

قرآن مجید اور حضور نبی اکرمؐ کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے ملزم کو بے گناہ سمجھا جائے۔ اور جرم ثابت ہو جانے پر قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ الزامات کی کبھی تشہیر نہ کی جائے۔ ان کے جرم ثابت ہونے کا انتظار کیا جائے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ غنیمت ہوا کہ ملک میں مارشل لا لگ گیا اور مجرمین گرفت میں آ گئے۔ ایسا نہ ہوتا تو انہیں کون پوچھ سکتا تھا؛ یہ اسی طرح دندناتے پھرتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مجرمین کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ایک عادل حکومت کا فریضہ ہے۔ اور اگر کوئی حکومت اپنے اس فریضہ کو ادا کرتی ہے تو وہ مستحق تبریک و تحسین ہے۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں انہیں یہ نہیں سمجھنا اور کہنا چاہیئے کہ اگر مجرم انسانی احتساب کی گرفت میں نہ آئیں، تو انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ خدا کو ماننے والوں کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ مجرم انسانی احتساب کی گرفت میں آئیں یا نہ آئیں، اس احتساب کے اوپر ایک اور نظامِ احتساب ہے جس کی گرفت سے کوئی مجرم بچ نہیں سکتا۔

اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یہ ہماری وہ فراموش کردہ حقیقت ہے جس کی ہم یاد دہانی نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں (بلکہ دنیا میں) جرائم عام ہو رہے ہیں، اسی حقیقت کی فراموشی کا نتیجہ ہے۔

دین کا سارا نظام، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ سارا نظامِ کائنات ہی اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ:-

(۱) خدا نے ہر کام کا ایک نتیجہ مقرر کر رکھا ہے جو ہر حال میں برآمد ہو کر رہتا ہے۔ نظامِ کائنات میں اسے سلسلۂ علت و معلول (LAW OF CAUSE & EFFECT) کہا جاتا ہے۔

(۲) جو قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے، وہی انسانی دنیا میں نافذ العمل ہے۔ یعنی انسان کا کوئی عمل (کام) کبھی نتیجہ مرتب کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غلط کام کا نتیجہ تباہ کن (جسے عام طور پر سزا کہا جاتا ہے) اور صحیح کام کا نتیجہ منفعت بخش (جسے جزا کہہ کر پکارا جاتا ہے) صحیح اور غلط کا معیار بھی خود خدا کا مقرر کردہ ہے۔

خارجی کائنات میں، قانونِ مکافات کی کارفرمائی کے متعلق نہ کسی کو کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے نہ کسی قسم کا اختلاف۔ سائنس کا سارا مدار اسی قانون پر ہے، اور ہر سائنٹیفک عمل کا نتیجہ اس قانون کی زندہ شہادت۔ لیکن انسانی دنیا میں دو قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی دنیا میں صرف سوسائٹی کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔ ان سے بالا (یا علاوہ) کوئی اور قانون نہیں۔ اس نظریہ کی رو سے سوسائٹی (یا حکومت) تمدنی

زندگی کے لئے کچھ قواعد و ضوابط وضع کرتی ہے۔ جو کام ان ضوابط کے مطابق کئے جاتے ہیں، انہیں صحیح کہا جاتا ہے، جو ان کے خلاف ہوں انہیں غلط (یا جرائم) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جرائم کی پاداش کے لئے سوسائٹی نے ایک نظامِ احتساب و مواخذہ مقرر کر رکھا ہے۔ جو مجرم اس احتساب کی گرفت میں آجاتا ہے اسے اس کے کئے کی سزا مل جاتی ہے۔

لیکن یہ نظامِ احتساب و مواخذہ اور عدل و انصاف اس قدر ناقص ہے کہ مجرمین اس کی گرفت سے بچنے، یا گرفت میں آجانے کے بعد جرم کی پاداش سے محفوظ رہنے کے لئے طرح طرح کی تدابیر وضع اور اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف کئی بے گناہ مفت میں سزائیں بھگتتے ہیں۔

یہ جو دنیا میں جرائم اس قدر عام ہو رہے ہیں اور دھاندلیوں کی بھی کوئی حد نہیں تو وہ نظامِ احتساب و عدل کے اسی نقص کا نتیجہ ہے۔ انسانی سوسائٹی آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جو ان نقائص سے مبرا ہو۔

اس نظریہ کو (قرآنِ کریم کی روشنی میں) الحاد۔ بے دینی۔ کفر۔ انکارِ خدا۔ دہریت۔ مادہ پرستی۔ سیکولرازم۔ کمیونزم۔ سوشلزم وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں (عملاً) یہی نظریہ کارفرما ہے۔ ان قوموں میں بھی جو خدا کا کھلے بندوں انکار کرتی ہیں، اور ان میں بھی جو زبان سے اس پر ایمان کی معترف ہیں لیکن عملاً اس سے انکاری ہیں۔ انہی میں (ہم) مسلمانوں کی قوم بھی شامل ہے۔ ہم میں بھی جو جرائم اس قدر عام ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

اس کے برعکس، ایک نظریہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید) میں دیا ہے۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں کہ سوسائٹی کا کوئی نظامِ احتساب و عدل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ کارفرما ہے یا معطل ہے۔ کوئی اس کی گرفت میں آتا ہے یا اس سے بچ جاتا ہے — خدا نے اپنا نظامِ احتساب و عدل مقرر کر رکھا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل (کام) نہ اس کی نگاہ سے اوجھل رہ سکتا ہے، نہ گرفت سے باہر، اور نہ ہی بلانتیجہ۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ (۲/۲۸۴) جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، وہ ارادہ کی شکل میں دل میں رہے، یا عمل کی صورت اختیار کر کے نمودار ہو جائے۔ وہ نظامِ خداوندی کے محاسبہ سے نہیں بچ سکتا۔ یہ نظامِ احتساب و عدل کیا ہے اور کس طرح کارفرما ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن خدا نے یہ بتایا ہے کہ ساری کارگہِ کائنات اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ کار ہے۔ فرمایا:۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا
عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۔ (۵۳/۳۱)

یہ تمام سلسلۂ کائنات خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ غلط کام کرنے والوں کو ان کے جرائم کی سزا ملے اور اچھے کام کرنے والوں کو اُن کے حسنِ عمل کا خوشگوار صلہ ملے۔

اس نظام کی جزرسی اور باریک بینی کا یہ عالم ہے کہ:۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا يَّرَهٗ - (۹۹/۸)

صحیح اور غلط کاموں کے ایک ایک ذرّہ کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔

کوئی مجرم اس کی گرفت میں آکر چھوٹ نہیں سکے گا کہ :-

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ - (۸۵/۱۲) تیرے رب کے قانونِ احتساب کی گرفت بڑی سخت ہے۔

اس کے بعد اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے کہ :-

لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ - (۲/۴۸)

اس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے سزا پائے گا اور نہ کوئی، کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بٹا سکے گا۔ ہر ایک اپنے کیئے کی سزا خود بھگتے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آ سکے گی۔ نہ کوئی کچھ دے دوا کر سزا سے بچ سکے گا۔ نہ ہی کسی کو اس کی مجال ہوگی کہ وہ مجرم کی مدد کو پہنچ سکے۔

اس طرح لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ - (۲/۲۸۶) ہر شخص کو اس کے اچھے کام کی جزا اور غلط کام کی سزا مل کر رہے گی۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى - (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ - (۱۶/۳۳) کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔

یہ ہے نظامِ احتساب و عدل کا دوسرا نظریہ۔ خدا پر ایمان لانے سے (عملاً) مراد ہے اس نظام کی صداقت پر یقین رکھنا۔ آپ سوچیئے کہ اس نظریہ یا نظام پر ایمان رکھنے والوں سے کبھی کوئی جرم سرزد ہو سکتا ہے؟ اگر سہو و خطا سے کبھی ایسا ہو جائے تو وہ (قانون میں رکھی گئی گنجائش کے مطابق) اس کی تلافی کی فوراً کوشش کریں گے۔ اسے اصطلاح میں توبہ کہتے ہیں۔ (یعنی اپنی خطا کاری پر ندامت؛ آئندہ کے لئے اس سے مجتنب رہنے کی یقین دہانی؛ اور زیادہ سے زیادہ حسنِ عمل سے اس نقصان کے ازالہ کی کوشش جو اس لغزش سے واقعہ ہو گیا تھا)۔

معاشرہ کے وہ ملزم جن کی اس وقت گرفت ہو رہی ہے اگر وہ واقعی مجرم ہیں تو وہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آ رہے ہیں۔ ہم تو محرمانِ رازِ درونِ خانہ میں سے نہیں تھے اس لئے ہمیں پسِ پردہ بدعنوانیوں کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ان میں سے جو غلط کاری کبھی اُبھر کر سامنے آجاتی تھی تو ہم اس پر ان اربابِ حل و عقد کو متنبہ کرتے اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی یاد دہانی کراتے تھے۔ لیکن اس قسم کی یاددہانی کا فائدہ تو اسے ہی ہو سکتا ہے جس کا اس قانون پر ایمان ہو —— اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، آج اس قانون پر (بجز مستثنیات) شاید ہی کسی کا ایمان ہو۔ اگر اس پر ایمان ہو تو یہ دنیا جنت بن جائے۔

اس نظریہ (یا قانون) کے خلاف اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم، ظلم کئے چلا جاتا ہے۔

اور مظلوم تڑپ کر مر جاتے ہیں، لیکن اس ظالم کی کلائی نہیں مروڑی جاتی۔ اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔ وہ بلکہ اور پنپتا چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ خود اللہ تعالیٰ نے) یہ بتائی ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس سے مقصد، غلط کاروں کو اصلاح کا موقعہ دینا ہوتا ہے۔ اگر ان کا نصیبہ یاوری کرے اور وہ اپنی اصلاح کر لیں تو ھُوَ المراد۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا ہے اور اس وقت نہ ان کا چیخنا چلانا ان کے کسی کام آ سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی اور ان کی مدد کر سکتا ہے۔ کسی اور کا ان کی مدد کے لئے آنا تو ایک طرف، اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ: اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۴۳/۶۷) اس وقت دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ قرآن ہی کے الفاظ ہیں۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ۔ دوست، اپنے دوست سے، (آنکھ بچا کر) بھاگ جائے گا۔ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ۔ ماں اور باپ تک کنارہ کش ہو جائیں گے وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ۔ بیوی اور بچے سب آنکھیں بدل لیں گے۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔ (۸۰/۳۴-۳۷) اس دن ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہوگی اور ہر ایک اپنے بچاؤ کی فکر میں بدحواس ہوگا۔ اس دن سب سازشیں اور تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۵۲/۴۶)

یہ ہوتی ہے کیفیت اس وقت جب خدا کے نظامِ عدل و احتساب کا فولادی پنجہ، مجرمین کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ ہمارے ہاں ہوا یہ کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے خدا کے 'نظامِ عدل و احتساب' اور اس کی رو سے ملنے والی سزاؤں کو "قیامت" پر اٹھا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظالم، مستبد، سرکش مجرمین مطمئن ہو گئے کہ ہمیں دنیا میں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اور یوں وہ اپنے ظلم و ستم کی کارستانیوں میں اور دلیر ہو گئے۔ قیامت کی جزا و سزا برحق، اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں کہ خدا نے اپنے نظامِ عدل و احتساب کا دائرہ (JURISOICTION) اُخروی زندگی کو قرار دے رکھا ہے اور اس دنیا کو بے محابا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرتا پھرے، اُسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اس نے کہا ہے، اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ یہ دنیا اور اگلی دنیا دونوں اس کے (خدا کے) قانونِ مکافات کے حلقۂ اقتدار و نفوذ کے اندر ہیں۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے کہ:-

اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (۹/۷۴)

اگر یہ لوگ اس سے روگردان کریں گے تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں الم انگیز سزا دیگا۔

اور سب سے بڑی سزا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (۲/۱۱۴) ہے۔ یعنی اس دنیا میں ذلت و رسوائی۔ یہ سزا انسانوں کے ہاتھوں ہی سے ملتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:-

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ (۹/۱۴)۔

جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ تم ان سرکشوں کے ساتھ جنگ کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلائے گا۔ انہیں ذلیل و رسوا کرے گا اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرے گا۔

واضح رہے کہ اس آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ ان مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا جماعتِ مومنین کے ہاتھوں ملے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سزا ہر حال میں انہی لوگوں کے ہاتھ سے ملے جو قوانین خداوندی کے پابند ہوں۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ جب کسی ملک کی بدعنوان حکومت کی غلط کاریوں سے مملکت کمزور ہو جائے تو کوئی ایسی قوم اس پر چڑھ دوڑے جس کے پاس دنیاوی قوت ان سے زیادہ ہو۔ اور بعض اوقات، اس عذاب کی شکل وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ - اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ - (۶/۶۵)

ان سے کہو کہ غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ (۱۶/۳۵-۳۴)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے (لیڈر اور عوام) مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اور ملک یوں تباہ ہو جاتا ہے۔

دیکھو ہم کس طرح اپنے قوانین کو پہلو بدلا بدلا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

بعض اوقات اس مقصد کے لئے خود ظالمین کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ - (۶/۱۳۰)

اس طرح خود ظالمین کا ایک گروہ دوسرے گروہ کا حلیف بن جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ یک رنگ ہوتا ہے۔

یہ ہیں عذاب (سزاؤں اور تباہیوں) کی وہ شکلیں جن کے متعلق قرآن کریم نے (WARN) کیا کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً - (۸/۲۵)

اس فتنہ سے محتاط رہو کہ جب وہ آتا ہے تو صرف ظالمین تک محدود نہیں رہتا۔ وہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔

اور یہاں سے ہماری سوچ کا رُخ ایک اور سمت کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جرائم کے مرتکب تو تھے ظالمین، لیکن ان کے نتائج ہیں جو عذاب آیا، اس میں سارا معاشرہ مبتلا ہو گیا۔ انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو یہ بھی اس تباہی کی لپیٹ میں آ گئے۔ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب بڑے محاکاتی انداز میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہنم میں لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS)

یعنی عوام، یکجا مبتلائے عذاب ہونگے تو ان میں باہمی سخت جھگڑا ہوگا۔

> وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار اور اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستے پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ (تم صحیح راستے پر چلنا چاہتے تو ہمارے پاس کونسی قوت تھی جس سے ہم تمہیں مجبور کر کے غلط راستے پر ڈال سکتے تھے) ہم غلط راستے پر چل رہے تھے۔ تم نے ہمارا اتباع شروع کر دیا اور اسی راستے پر چل نکلے۔ اب اس عذاب میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ (۳۷/۲۷-۳۳)

عوام کا یہ عذر کہ ہماری گمراہی کے ذمہ دار یہ لیڈر ہیں بارگاہِ خداوندی میں بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ ان لیڈروں کو اس قابل تم نے ہی تو بنایا تھا کہ وہ اس قسم کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہوتے۔ اگر تم اقتدار ان کے سپرد نہ کرتے تو یہ ان زیادتیوں کے مرتکب کس طرح ہو سکتے تھے؟

آپ ذرا اس حقیقت کو اپنے احوال و ظروف پر منطبق کر کے دیکھئے۔ اس وقت کم و بیش ساری قوم چلا رہی ہے کہ سابقہ اربابِ اقتدار نے یہ زیادتی کی اور وہ زیادتی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں صاحبِ اقتدار بنایا کس نے تھا؟ خود ہم ہی نے۔ اگر ہم انہیں سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کامیاب نہ کراتے، تو وہ اس قسم کی بدعنوانیاں کس طرح کر سکتے! ان کے پاس کوئی ذاتی قوت نہیں تھی۔ یہ ساری قوت خود ہماری تفویض کردہ تھی۔ بقول کسے؎

تمہیں تو "تم" کے سوا، کوئی کچھ نہ کہتا تھا   جناب ہم نے بنایا، حضور ہم نے کیا

آپ کہیں گے کہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ اس قسم کے ہیں؟

اور یہی تو آپ کا بنیادی قصور ہے۔ یہی وہ سب سے بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں آپ بھی اس عذاب میں مبتلا ہیں —— اور ہمارا، آپ کا، یہ جرم، یہ قصور، کچھ نیا نہیں۔ ہم شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج قوم کی طرف سے مطالبات ہو رہے ہیں کہ اس ممبر کی انکوائری کرو، اس وزیر کی تحقیق کرو۔ اس چیف منسٹر کی تفتیش کرو۔ لیکن اگر آپ یہی مطالبہ اس وقت کرتے جب یہ لوگ (سنہ ۱۹۷۰ء میں) انتخابات کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوتے تھے، تو نہ یہ ملک تباہ ہوتا اور نہ ہی آپ اس عذاب میں مبتلا ہوتے۔ اور یہ کچھ سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے یہاں شروع ہی سے ایسا انداز چلا آ رہا ہے۔ جو لوگ برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں، ہم ان کی انکوائری نہیں کرتے۔ لیکن جب وہ اقتدار سے برطرف ہو جاتے ہیں تو ان کی انکوائریاں کراتے پھرتے ہیں۔ ان انکوائریوں سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ لوگ مجرم ثابت ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ سزا مل جاتی ہے۔ لیکن کیا اس سے ان بے پناہ نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے جو وہ ملک اور مملکت کو پہنچا چکے ہوتے ہیں؟ اور تماشا یہ کہ ہم ان کی تو انکوائریاں کراتے ہیں لیکن جو ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں ان کی انکوائریوں کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بلا دیکھے بھالے، آنکھ بند کر کے، ان کے حق میں ووٹ دے کر انہیں برسرِ اقتدار لے آتے ہیں اور

جب وہ تباہی مچا چکتے ہیں اور اقتدار ان سے چھن جاتا ہے تو ان کی انکوائریوں کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں! اصل یہ ہے کہ اس قسم کی انکوائریوں کے مطالبہ کے پیچھے جذبہ یہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے قوم اپنے آپ کو یہ (جھوٹا) اطمینان دلا لیتی ہے کہ ان تباہیوں کے ذمہ دار ہم نہیں۔ یہ لیڈر ہیں۔ قوم اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد اقتدار پھر ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جن کے متعلق کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کی ہوتی۔ جب وہ بھی وہی کچھ کرتے ہیں تو پھر یہ چیخنے چلّانے لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم ایک ایسا اصول بطور رہنمائی دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے قوم اس قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ حضورؐ نبی اکرم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ بڑا عظیم دعویٰ تھا۔ قوم نے آپؐ سے کہا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپؐ اس دعوےٰ میں سچے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سوال کے جواب میں حضورؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں کونسی شہادت پیش کی! آپؐ نے فرمایا کہ:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰/۱۶)

> میں تم میں اجنبی نہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اس دعوےٰ سے پہلے (مِنْ قَبْلِهٖ) تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ تم میری سابقہ زندگی پر غور کرو اور پھر جذبات سے الگ ہٹ کر عقل و فکر کی رو سے فیصلہ کرو کہ کیا اس قسم کی زندگی جھوٹوں کی ہوتی ہے یا سچوں کی!

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں اصول کیا پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہ ہر مدعی کے ماضی (سابقہ زندگی) کو سامنے لاؤ اور اس سے پرکھو کہ اس کا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھے نبی تسلیم کر لو اور اس کے بعد دیکھو کہ میں کس قسم کا انسان ثابت ہوتا ہوں۔ فرمایا یہ کہ تم میری سابقہ زندگی پر غور کرو اور اس سے اندازہ لگاؤ کہ میں کس قسم کا انسان ہوں۔ میرا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ اگر ہم اس اصول کو اپنے سامنے رکھ لیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں کہ جو شخص کسی منصب یا اقتدار کے لئے آگے آتا ہے، اس کی سابقہ زندگی اُس کے متعلق کیا کہتی ہے، تو ہم ان تباہیوں سے بچ جائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے باوجود بعض افراد ایسے نکل آئیں گے جو اختیارات ہاتھ میں آنے کے بعد بدعنوانیاں کرنے لگ جائیں۔ لیکن یہ مستثنیات .... (EXCEPTIONS) ہوں گی۔ اور جب یہ ان لوگوں کے ساتھ کام کریں گے جن کی اکثریت دیانتداروں پر مشتمل ہوگی تو انہیں بدعنوانیوں پر اترنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ فرد کے لئے اس کے رفقاء کا کردار بڑا مؤثر ہوتا ہے، اور لغزشوں کی روک تھام کا موجب۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ: كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (۹/۱۱۹) سچوں کی رفاقت اختیار کرو۔

کسی شخص کے ماضی کے کردار کو پرکھنے کے لئے ہمارے صدرِ اوّل کے معاشرہ نے ہمارے لئے بڑی برجستہ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے، ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنے دعوےٰ کی تائید میں کسی قابلِ اعتماد آدمی کو پیش کرے۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے پوچھا کہ:۔

کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا۔ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا؟ جب اس نے اس پر بھی کہا کہ 'نہیں' تو آپ نے فرمایا کہ:-

> پھر تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ (شاہکار رسالت صفحہ ۲۴۴)

اس قسم کی تحقیق فردِ متعلقہ کی ذات تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اس کے اہلِ خانہ کو بھی محیط ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ:-

> جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرکے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچوگے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسوگے تو وہ بھی پھنسیں گے اگر تم میں سے کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے۔ جو چاہے ان کے اندر رہے۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۲۹۷)

اہلِ خانہ ہی کو نہیں۔ اس میں اس کے دوستوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ "حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حقوق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاف فرمایئے۔ مجھے اپنا دوست نہ بنایئے۔ دور دور ہی رہنے دیجیئے۔" (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۹)

حضرت عمرؓ کا یہ اصول بھی یاد رکھئے کہ:-

> جو شخص شر پیدا کرکے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۳۵)

جس شخص کو کسی منصب کے لئے منتخب کرنا مقصود ہو اس کے متعلق دیکھو کہ کیا وہ اس معیار پر پورا اُترتا ہے کہ:-

> جب وہ اس منصب پر فائز ہو تو وہ اپنی قوم کا سردار نظر آئے۔ اور جب اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۸۵)

انتخاب کے امیدواروں کے ماضی کو اس قسم کے معیاروں کے آئینے میں پرکھو اور جب وہ شرافت، عصمت، دیانت، امانت، حسنِ معاملہ، انصاف، عدل، وسعتِ قلب، کشادگیٔ ظرف، استغناء وغیرہ کے اصولوں پر پورے اتریں تو پھر انہیں اس قابل سمجھو کہ انہیں اختیار و اقتدار سونپا جا سکتا ہے۔ اس قبل از وقت، انکوائری کے بعد آپ کو نہ تو بعد میں چیخنا چلّانا پڑے گا اور نہ ہی انکوائری کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس قسم کی انکوائری کے لئے عملی پروگرام یہ ہونا چاہیئے کہ انتخابات کی تاریخ سے کم از کم تین چار ماہ قبل، امیدواروں کی فہرستیں (قواعد و ضوابط کی رو سے) مکمل ہو کر شائع ہو جائیں۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں، متعلقہ حلقۂ انتخاب کے رائے دہندگان کا فریضہ ہو کہ وہ اپنے اپنے حلقہ کے امیدواروں کی ماضی کی زندگی کی پوری پوری چھان پھٹک کریں۔ اس سلسلہ میں، انہیں حکومت بھی مطلوبہ معلومات فراہم کرے (ضابطۂ انتخابات

ہیں، حکومت پر ایسا کرنے کی پابندی ہونی چاہیئے، بشرطیکہ اس میں کوئی قانونی موانعات نہ ہوں)۔ اس کے بعد رائے دہندگان، اپنے معیاری امیدوار کے حق میں ووٹ دیں اور ایسا کرتے وقت اس نوعیت کا حلف نامہ داخل کریں کہ انہوں نے اس امیدوار کے ماضی کے متعلق اپنا پورا پورا اطمینان کر لیا ہے۔ انتخابات کے بعد بھی ایک مستقل کمیشن موجود رہنا چاہیئے جس کا فریضہ ہو کہ جس ممبر کے خلاف کوئی الزام عائد ہو، اس کی بلاتاخیر تحقیقات کرے، اور اگر وہ الزام صحیح ثابت ہو جائے تو اسے رکنیت سے برطرف کر دے، اور آئندہ کے لئے نااہل قرار دے دے۔ اس طرح ساتھ کے ساتھ عملِ تطہیر سے ملک بہت سی تباہیوں سے بچ سکتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں "سیاسی ضابطۂ اخلاق" کا معیار بھی نرالا ہے۔ ایک صاحبِ اقتدار، کھلے بندوں بدعنوانیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے گھناؤنے جرائم زبان زدِ خلائق ہوتے ہیں۔ اس کے ذاتی کردار کے چرچے عام ہوتے ہیں۔ مخالف پارٹی اس کے خلاف تحقیقات کے مطالبے کرتی ہے۔ لیکن ایک صبح وہ اپنی پارٹی کو چھوڑ کر اسی مخالف پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے۔ اسے پارٹی کے بلند ترین منصب پر سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے سب عیب، ہنر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسے قوم کا ہیرو بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے افراد ہی نہیں، ایسی سیاسی پارٹیاں بھی سیاست میں حصہ لینے کی نااہل قرار دی جانی چاہیئں جن پارٹیوں کا معیارِ اخلاق یہ ہو کہ اپنی پارٹی میں شامل ہر غنڈہ اور بدمعاش، انتہائی شریف اور نیکوکار، اور مخالف پارٹی کا ہر فرد، غنڈہ اور بدمعاش۔ اور پھر پارٹی بدل لینے کے ساتھ ہی بد، نیک، اور نیک، بد بن جائے۔ ایسی پارٹیاں کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں!

* * *

اس دفعہ انتخابات کے سلسلہ میں اثاثوں کی تحقیقات کا عمل بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ بڑا مبارک اقدام ہے بشرطیکہ ان تحقیقات پر کوئی جانبدارانہ جذبہ اثر انداز نہ ہو۔ لیکن ضرورت اس سے ایک قدم آگے جانے کی ہے۔ ہمارے ہاں بددیانتی (CORRUPTION) سے بالعموم مراد روپے پیسے کی بددیانتی ہوتی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن کیریکٹر صرف روپے پیسے کے معاملہ میں دیانتداری کا نام ہی نہیں۔ کیریکٹر تو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے — افراد کے خیالات، جذبات، عزائم، ارادے، نفسیاتی رجحانات وغیرہ سب اس میں آ جاتے ہیں۔ ایک شخص روپے پیسے کے معاملہ میں تو دیانتدار ہے، لیکن جھوٹا، منافق، خوشامدی، جاہ پرست، تنگ نظر، حاسد، کمینہ فطرت ہے۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں اقتدار سونپ دینا، کچھ کم تباہی کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معنی میں دیکھئے تو ایسا شخص، روپے پیسے کے معاملہ میں بددیانت آدمی سے بھی زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مالی نقصان کا ازالہ تو ممکن ہے لیکن اس قسم کا صاحبِ اقتدار قوم کو جس قسم کا نقصان پہنچا جاتا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔ وہ تو معاشرہ کے سارے تالاب کو گندہ کر جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں جرائم کا ذکر تو ایک آدھ بار آتا ہے لیکن منافقین کی تباہ کاریوں کے تذکرہ اور ان سے محتاط رہنے کی تاکیدات سے آدھا قرآن بھرا پڑا ہے۔

طلوعِ اسلام ذاتیات پر نہیں اترا کرتا، بجز اس کے کہ کسی اصولی نکتہ کی وضاحت کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے، ورنہ ہم نام لے لے کر بتاتے کہ کس طرح ایک شخص (مثلاً) پیپلز پارٹی کے یومِ تاسیس سے اس کے اندرونی حلقہ میں ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ برسوں اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بلند ترین مناصب و مدارج پر فائز ہوتا ہے۔ پارٹی کے ہر اہم فیصلہ اور اقدام میں کبھی شریک اور کبھی مشیر ہوتا ہے۔ جلوت و خلوت میں مسٹر بھٹو کا رازداں ہوتا ہے۔ اس تمام دوران میں، پیپلز پارٹی کو بالعموم اور مسٹر بھٹو کو بالخصوص ملک کے لئے آیۂ رحمت اور قوم کے لئے سایۂ عاطفت قرار دیتا ہے۔ اپنے قائد کے جمال کو نوشیروانی عدل کا عکاس اور اس کے جلال کو اسداللّٰہی شمشیر کا آئینہ دار بتاتا ہے۔ وہ برسوں اس قسم کی قصیدہ خوانی میں مصروفِ نشید رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ ایک دن اپنے منصب سے الگ کر دیا جاتا ہے تو جھٹ سے مخالف پارٹی میں جا ملتا ہے اور ببانگِ دھل آواز دیتا ہے کہ آؤ لوگو! میں تمہیں بتاؤں کہ پیپلز پارٹی کس طرح ڈاکوؤں اور لٹیروں کی جماعت ہے۔ اور اس کا لیڈر کتنا بڑا فرعون، نمرود، شداد اور یزید ہے۔ اور اس کے بعد وہ گلی گلی، کوچہ کوچہ، ان دہشت انگیز جرائم کی نقاب کشی کرتا ہے جن کا (بقول اس کے) اس پارٹی کی طرف سے، اس عرصہ میں ارتکاب ہوا تھا، جس عرصہ میں وہ خود اس پارٹی میں شریک تھا۔ قوم، اس کی بیان کردہ وحشت و بربریت کی داستانوں کو مزے لے لے کر سنتی ہے، اور اس سے کوئی اتنا نہیں پوچھتا کہ یہ سب داستانیں اس دور سے متعلق ہیں جب آپ خود اس پارٹی کے اندرونی حلقہ میں شامل تھے، اس لئے اگر آپ ان جرائم کے ارتکاب میں خود شریک نہیں تھے، تو کم از کم ان کے رازدان تو تھے، لہٰذا آپ سے

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اگر آپ ان رازہائے درونِ پردہ کا انکشاف اس وقت کرتے جب یہ پہلی مرتبہ آپ کے علم میں آئے تھے تو قوم اُن سے بروقت متنبہ ہو جاتی اور ان کے تدارک کی کوئی تدبیر سوچ لیتی۔ آپ برسوں ان خفیہ جرائم کو ہوتا دیکھتے رہے، اور نہ صرف یہ کہ قوم کو ان سے خبردار نہ کیا، بلکہ ان کے مرتکبین کے حق میں مدح و ستائش کے قصائد پڑھتے رہے اور اس طرح قوم کو فریب دیتے رہے۔ آج آپ اپنے آپ کو بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

اتنا ہی نہیں کہ قوم میں سے کوئی ایسے لوگوں سے یہ سوال نہیں پوچھتا، بلکہ جس پارٹی میں یہ شامل ہو جاتے ہیں، وہ انہیں قوم کا ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے! آپ سوچئے کہ اگر کل کو اس قسم کی پارٹی اور اس میں شامل اس قسم کے کیریکٹر کے افراد برسرِ اقتدار آ جائیں، تو یہ کیا کچھ نہیں کریں گے؟ جرم کے مرتکب ہی مجرم نہیں ہوتے۔ جرائم کی پردہ پوشی کرنے والے اور ایسے لوگوں کو ہیرو قرار دینے والے سب زمرۂ مجرمین میں شامل کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ نے افرادِ قوم کے ماضی کی چھان بین کرنی ہے تو اسے روپے پیسے تک محدود نہ رکھئے، ان کے اس قسم کے اعمال کی بھی چھان بین کیجئے کہ ان کے صحیح کیریکٹر کی پرکھ اسی سے ہو سکے گی۔

* * *

ہم نے بات شروع کی تھی خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے۔ اس مواخذہ میں صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر ایسے فرد، پارٹی یا قوم میں بازآفرینی کی صلاحیت باقی نہ رہی ہو تو اس کی تباہی ابدی ہو جاتی ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ

اَحَادِیْثَ ۔ (۲۳/۴۴) اس کے بعد ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں کہ وہ آنے والی قوموں کے لئے آیۂ عبرت بنیں۔ لیکن اگر ان میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے تو خدا کا قانون انہیں ایک اور موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنی سابقہ غلط کاریوں پر پشیمان ہوں۔ آئندہ کے لئے ان سے مجتنب رہنے کا عہد اور عزم کریں۔ اور سابقہ نقصانات کی تلافی۔ اس تلافی کی اس نے ایک ہی صورت بتائی ہے۔ اور وہ یہ کہ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) تخریب کاری کے نتائج کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرے۔ اسی کو قرآن اصطلاح میں تَابَ وَ اَصْلَحَ کہا جاتا ہے۔

⁂

اس کے بعد ہم دو لفظ اس گروہ سے بھی کہنا چاہتے ہیں جو سابقہ پارٹی کی جگہ برسرِ اقتدار آنے کے لئے کوشاں ہے۔ اور وہ دو لفظ یہ ہیں کہ اس وقت آپ میں اور سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہیں اقتدار کے استعمال کرنے کا موقعہ مل گیا تھا اور آپ کو ابھی وہ موقعہ نہیں ملا۔ اس فرق سے آپ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے دیں کہ سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی عیوب کا مجسمہ تھی اور آپ کا گروہ پاکیزگیوں پر مشتمل ہے۔ اگر آپ برسرِ اقتدار آنے کے بعد، عبرتناک انجام سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے گروہ میں شامل افراد کا ابھی سے محاسبہ کیجئے اور صرف ان لوگوں کو اپنے ساتھ رکھئے جن کا ماضی آئینہ کی طرح شفاف ہو۔ یاد رکھئے! قانونِ خداوندی کی رو سے" اقتدار عیش سامانیوں کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ قوموں اور جماعتوں کے کیریکٹر کے پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آنے والوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۰/۱۴)

(ان جانے والوں کے بعد) ہم نے تمہیں اقتدار دیا تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟

نہ ہی آپ عوام کے نعروں سے فریب میں آ جائیں۔ ہماری قوم کا شیوہ یہ ہے کہ یہ ہر آنے والے کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی ہے اور جب وہ جاتا ہے تو اسے جوتیوں سے نوازتی ہے ...... اُسے جوتیوں سے نوازتی ہے اور آنے والے پر پھول نچھاور کرتی ہے اور اس کے جانے پر" اس سے بھی وہی سلوک کرتی ہے جو سابقہ جانے والے کے ساتھ کیا تھا۔ آپ اپنے ملک کی تیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور اس آمد و رفت کے مناظر کو سامنے لائیے۔ وہ انہی پھولوں اور جوتیوں کا مرقع نظر آئیں گے۔ سعدیؔ نے اسی لئے کہا تھا کہ:-

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری — شادی مکن کہ با تو ہمیں ماجرا رود

اگر ہمارے ہاں کے آنے جانے۔ اور جانے، آنے والے اس نکتہ کو سمجھ لیں، اور قوم اس حقیقت سے واقف ہو جائے کہ پھولوں کے ہار اسی گردن میں ڈالنے چاہئیں جو اس کی مستحق ہو، تو آج قوم کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔

لیکن ایسا شعور تو قرآنی اقدار کی تعلیم اور اس کے مطابق تربیت سے بیدار ہوتا ہے" اور اسے کوئی درخورِ توجہ نہیں سمجھتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں مسلسل کوشش یہ چلی آ رہی ہے کہ سادہ دل مسلمان:-

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اور اس کا کسی کو احساس ہی نہیں کہ: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ (۸۵/۱۲) "تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے۔"

⁂

ان دنوں ایک اور اہم سوال بھی بار بار دلوں میں ابھرتا اور اکثر زبانوں پر آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں وہ بنیادی نقص کیا ہے جس کی وجہ سے یہاں کوئی حکومت پائیدار نہیں رہتی۔ کسی آئین کو استحکام نصیب نہیں ہوتا آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں فسادات رونما ہوتے ہیں اور پھر فوج کو بار بار مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ ان ہچکولوں اور زلزلوں سے مملکت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ اس مسلسل گردشِ دولابی سے قوم کی حالت یوں ہو رہی ہے گویا یہ ایسی کشتی پر سوار ہے جو طوفان آمیز موجوں کے تلاطم میں گھر چکی ہو اور اسے دھڑکا لگ رہا ہو کہ یہ اب ڈوبی کہ ڈوبی۔

یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہرے فکر و تدبر کا محتاج۔ تقسیمِ ہند سے پہلے ہمارے ہاں کیفیت یہ تھی کہ ملک میں ایسے اربابِ فکر و تدبر بکثرت موجود تھے جو ہنگامہ آرائیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے اور ملت سے متعلق اہم معاملات پر، نہایت سکون و سکوت کے ساتھ غور و فکر کر کے، قوم کو راہ نما اصولوں سے بہرہ یاب کر دیتے تھے ——— ملک تو وسیع و عریض تھا۔ ایک پنجاب، بلکہ اسی شہر لاہور میں اس قسم کے اربابِ دانش و بینش کتنے ہی موجود تھے، لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہنگامی سیاست اس قدر عام ہو گئی کہ اس قسم کے خاموش دیدہ وروں کی اہمیت کم ہوتی گئی اور یوں محسوس ہونے لگا گویا قوم کو ان کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آہستہ آہستہ ان کا وجود ہی ختم ہو گیا اور قوم ایسے قافلہ کی طرح ہو گئی جس کا میرِ کارواں کوئی نہ ہو۔ علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہ دیا تھا کہ جو قوم فکری راہ نمائی سے محروم ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قوم اسی محرومی کا شکار ہو چکی ہے۔ طلوعِ اسلام انہی خاموش مفکرین کی یادگار ہے۔ علیٰ قدرِ وسعت اپنا فریضہ ادا کئے جا رہا ہے۔ اور تند و تیز ہواؤں میں بھی کوشش کر رہا ہے کہ یہ چراغ بجھنے نہ پائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ہماری بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم نے مغربی جمہوریت کو بلا سوچے سمجھے اپنا نظامِ سیاست قرار دے رکھا ہے، حالانکہ ——— علاوہ اس کے کہ یہ اسلامی نظامِ سیاست کے یکسر خلاف ہے ——— یہ ہمارے حالات کے بھی موافق نہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں صدیوں سے قوم کی سیاسی تربیت ہوتی چلی آ رہی ہے اس لئے وہاں جمہوری نظام، نسبتاً ہمواری کے ساتھ چلتا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سیاسی تربیت تو ایک طرف، قوم کا سیاسی شعور تک بیدار نہیں۔ اس لئے یہاں مسلسل تلاطم خیزیاں برپا ہوتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں آپ ایک بنیادی نکتہ پر غور فرمائیے۔ ہمارے آئین میں، اس سوال کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث ہوتی ہے کہ مملکت کا اقتدار کن لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے ——— قومی اور صوبائی مجالس قوانین ساز، اور سینٹ کی نشستیں۔ نشستوں کی تقسیم (ایلاٹمنٹ)۔ ان کے لئے امیدواری کی شرائط۔ ووٹروں کی خصوصیات۔ معینہ مدت کے بعد انتخابات۔ ان انتخابات کے لئے لمبے چوڑے انتظامات۔ پارلیمان کے متعلق قواعد و ضوابط اور حدود و قیود۔ کابینہ کا تعین۔ صدرِ مملکت اور وزارتِ عظمیٰ کے اختیارات۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور سے متعلق آئین میں وسیع پیمانے پر ہدایات اور احکامات موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں اس امر کے لئے کوئی مؤثر طریق کار نہیں ہوتا کہ اگر برسرِ اقتدار پارٹی بدعنوانیوں پر اتر آئے اور قوم اس سے تنگ آ جائے تو اسے اقتدار سے الگ کیسے کیا جائے! آئین میں اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ پارلیمان کی اس قدر اکثریت (دو تہائی اور بعض صورتوں میں سادہ اکثریت) عدمِ اعتماد کا ووٹ پاس کر کے صدر یا وزیرِ اعظم کو الگ کر سکتی ہے۔ اور وزیرِ اعظم کی علیحدگی سے اس کی کابینہ

خود بخود الگ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس طریقِ کار میں بنیادی خرابیاں ہیں۔ پہلی خرابی تو یہ کہ اس میں قوم بے دست و پا ہوتی ہے۔ عدمِ اعتماد کا ووٹ ارکانِ اسمبلی ہی پاس کر سکتے ہیں۔ قوم ہزار چیختی چلّاتی رہے، اگر اسمبلی کے ارکان ایسا ووٹ پاس نہیں کرتے تو قوم کچھ نہیں کر سکتی۔ اور دوسری خرابی یہ کہ اگر برسرِاقتدار پارٹی دو تہائی اکثریت کی حامل ہو، تو بے اعتمادی کا ووٹ پاس ہی نہیں ہو سکتا۔ قوم کو، اُن ارکان کے ہاتھوں جنہیں اس نے اپنے نمائندے منتخب کیا تھا، ایک معینہ مدت تک کے لئے، مبتلائے عذاب رہنا پڑتا ہے۔ قوم کی یہ بے بسی ہے جس سے اس کے سینے میں غصہ اور انتقام کے جذبات اُبھرتے ہیں اور جب ان کی تسکین کی کوئی آئینی صورت نظر نہیں آتی تو وہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح فسادات بن کر معاشرہ کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ جن جذبات کے باہر آنے کے لئے فطری راستے مسدود ہو جائیں، وہ اپنی نمود کے لئے غیر فطری راہیں تراش لیتے ہیں۔ غالبؔ کے الفاظ ہیں :ؔ

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ملک میں آئے دن کی ہنگامہ خیزیوں کے روکنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ قوم کو اس مقام تک نہ لے جایا جائے جہاں وہ تغیرِ احوال کے لئے اپنے آپ کو بے دست و پا، مجبور پائے۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی وہ بنیادی خرابی جس کی وجہ سے یہاں آئے دن ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ :-

(۱) جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، اپنے نمائندگان کو چننے وقت قوم، ان کے ماضی کو چھان پھٹک کر، ان کی دیانت و امانت اور شرافت و نجابت کی طرف سے اچھی طرح مطمئن ہو جائے۔ اور

(۲) اس کے بعد ایسی صورت نہ پیدا ہونے دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرتے رہیں، قوم ان کا کچھ بگاڑ ہی نہ سکے۔ وہ (نمائندگان) معینہ مدت تک، بہرحال قوم کے سر پہ سوار رہیں۔

یہ دوسرا مسئلہ ایسا ہے جس کے لئے قوم کے ارباب و بنیش کو مل بیٹھ کر سوچنا چاہیئے کہ آئین میں کس قسم کی تبدیلی کی جائے جس سے قوم اپنے نمائندوں کو منتخب کر کے، ایک مدتِ معینہ تک بے دست و پا ہو کر نہ رہ جائے بلکہ جس وقت دیکھے کہ ان نمائندوں کو قوم کا اعتماد حاصل نہیں رہا، قوم انہیں آئینی طور پر الگ کر سکے۔ اس تبدیلی کی عملی صورت کیا ہو، یہ بات اربابِ دانش و بینش کے سوچنے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے قوم کے مقرر کردہ، ایسے ادارۂ احتساب کی ضرورت ہوگی جو (۱) پارٹیاں وغیرہ سے الگ ہو۔ (۲) جس کے کان قوم کی آواز پر، اور نگاہیں اربابِ اقتدار کے اعمال و کردار پر ہوں۔ اور (۳) جب وہ قوم کے تقاضے کو محسوس کرے تو برسرِاقتدار طبقہ کو اقتدار سے الگ کر سکے۔ اور اگر اسے اس مقصد کے لئے ضرورت پڑے تو فوج کی مدد بھی حاصل کر سکے ــــ یہ اصولی سے خطوط ہیں جو اس مقصد کے لئے سردست ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کا حتمی فیصلہ اربابِ دانش و بینش کا وہ حلقہ کرے گا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر پاکستان کا کوئی بہی خواہ اس حلقہ کی تشکیل کے لئے عملی جدوجہد کرے تو وہ قوم کا بہت بڑا محسن ہوگا۔ اس کے لئے اس قسم کے اعتراضات کو آڑے نہیں آنے دینا چاہیئے کہ آئین میں ایسی شق نظامِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ یاد رکھئے! مغرب کا نظامِ جمہوریت منزل من اللہ نہیں جو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو کفر و الحاد سمجھ لیا جائے۔ ہمیں اپنے حالات کے مطابق آئین مرتب کرنا چاہیئے نہ کہ مغرب کی کورانہ تقلید میں بہے جانا چاہیئے۔

باسمہٖ تعالیٰ

بہ سلسلۂ قرآنی نظام

نظریۂ پاکستان پر کیا گذری؟

(۱۹۷۲ء کا خطاب، — عنوان اور الفاظ کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ)

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظریۂ پاکستان پر کیا گذری؟

دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب سقوطِ ڈھاکہ کا جانگداز المیہ پیش آیا تو پرویز صاحب پر اس کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ احباب ان کی صحت کے متعلق بے حد متفکر ہو گئے۔ پرویز صاحب اس قسم کے صدمات پر بڑے ضبط سے کام لیا کرتے ہیں لیکن اس موقعہ پر یہ ضبط انہیں اندر ہی اندر گھلائے چلا جا رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کوئی موقع ایسا مل جائے کہ وہ اپنے اس سوزِ نہاں کو لب پر لے آئیں تاکہ اس آتشِ خاموش کی حدت میں کچھ تو کمی ہو۔ یہ موقع اگست ۱۹۷۲ء میں "یومِ آزادی" کی تقریب نے مہیا کر دیا۔ اس تقریب پر انہوں نے اپنے خطاب کا جو عنوان تجویز کیا وہ ان کے سینے میں برپا ہونے والے طوفان کا غماز تھا۔ عنوان تھا ——— قائدِ اعظمؒ! آپ کہاں ہیں؟ ——— وہ جب اپنے اس خطاب کو ضبطِ تحریر میں لا رہے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے رواں تھے۔ اور جب انہوں نے اسے مجمع میں پیش کیا تو وہ سسکیاں بھر رہے تھے اور سارا ہال بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کے موضوع کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہاں قائدِ اعظمؒ کے خلاف نفرت پھیلائی گئی اور نظریۂ پاکستان کا مذاق اڑایا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ قصرِ پاکستان کی بنیادوں میں تزلزل آ گیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں نہایت وضاحت سے بتایا کہ قائدِ اعظمؒ کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کس طرح مطالبۂ پاکستان کی بنیاد، قرآنِ کریم پر رکھی۔ اور مطالبۂ پاکستان کی جس قدر مخالفت ہوئی وہ محض اس بنا پر تھی کہ، اس خطۂ ارض میں قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ پرویز صاحب کے اس خطاب نے ملک کے طول و عرض میں نمایاں اثر کیا۔

اب جو ملک گزشتہ کئی ماہ سے انتشار اور خلفشار کا شکار ہو رہا ہے تو اس میں اس قسم کی آوازیں بھی ابھرنی شروع ہو گئی ہیں جن سے علامہ اقبالؒ کی عظمت اور قائدِ اعظمؒ کا احترام دلوں سے مٹتا جائے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ (خدانخواستہ) یہاں بھی (سابق) مشرقی پاکستان کے سے حالات نہ پیدا ہو جائیں۔ اس احساس سے متاثر ہونے والے حضرات کا تقاضا ہے کہ پرویز صاحب کا مذکورہ بالا خطاب دوبارہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے (ضروری حک و اضافہ کے ساتھ) پیشِ خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔ (اسے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے)۔ خطاب کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے کہ یہ خطاب اگست ۱۹۷۲ء میں پیش کیا گیا تھا۔

* * *

خطاب

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

ہماری ملی زندگی میں آج کے دن سے زیادہ عزیز اور عظیم دن کوئی نہیں کہ اس دن ہم نے، انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنی آزاد مملکت کا افتتاح کیا تھا۔ ماسوائے سالِ گذشتہ (سنہ ۱۹۷۱ء) کہ ہمارا سیاسی مطلع گرد آلود تھا ہم اس تقریب کو بطورِ جشنِ مسرت مناتے رہے لیکن اس سال (سنہ ۱۹۷۲ء) جو میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں تو جذبات کی ایک عجیب دنیا دل میں لئے ہوئے۔ ایسے کچھ ایسے سمجھئے جیسے کوئی بوڑھا باپ، اپنے ان جواں سال جڑواں بیٹوں کی سالگرہ منا رہا ہو جن میں سے ایک کو وہ سپردِ خاک کر چکا ہو اور دوسرے کی تیمارداری میں مصروف۔ پچھلے سال اس سوختہ بخت ملک اور حرماں نصیب قوم پر جو کچھ بیتی، اور آج جن تذبذب آمیز حالات سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے احساس سے دل کا خون خود بخود کھینچ کر آنکھ میں آجاتا ہے۔ اور یہ تنہا ــــ مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا ــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ تعلقات جس قدر گہرے ہوں، اور ان کی مدت جتنی طویل، اسی نسبت سے اس کی بربادی کا غم شدید اور اس کی تباہی کا صدمہ عمیق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ آج پاکستان میں بہت کم حضرات ایسے ہوں گے جن کا سینہ مجھ ایسا فگار اور جن کا قلبِ حزیں اس قدر، برنگِ غنچہ لبریزِ جراحت ہو۔ میری کیفیت یہ ہے کہ: ؎

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں، بے زباں گورِ غریباں کا!

پاکستان کے ساتھ میرے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کا حصول میرے لئے تقاضائے دین تھا اور اس خطۂ پاک کا تحفظ میرا جزوِ ایمان ہے۔ باقی رہی ان تعلقات کی مدت، تو اس کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎

تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے

سنہ ۱۹۳۰ء کا پاکستانی

میں اس زمانے کا پاکستانی ہوں جب ہنوز پاکستان کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں جنگِ بلقان کے زمانے سے کہ میری عمر بمشکل، آٹھ نو سال کی ہوگی، ملتِ اسلامیہ کی سیاست سے دلچسپی لینے لگ گیا تھا۔ (میری تعلیم و تربیت ہی اس انداز سے ہوئی تھی) اس کے بعد، خود ہندوستان میں متعدد تحریکیں آندھیوں کی طرح اٹھیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے لئے وجہِ تسکینِ قلب نہ ہوئی تا آنکہ آج سے بیالیس پہلے سنہ ۱۹۳۰ء میں، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے الہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں اس منزل کی نشاندہی کر دی جو میرے لئے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مدعا بن گئی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ

رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا...... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے...... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور قوت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلام، مذہب نہیں، دین یعنی نظامِ حیات ہے، اور یہ نظامِ حیات اسی صورت میں زندہ اور قائم ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس سے، اپنی آزاد مملکت کا حصول میرے لئے تقاضائے دین بن گیا۔

۱۹۳۷ء میں جب قائدِ اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کے اس تصورِ اسلام کو عملی پیکر میں متشکل کرنے کے لئے مصروفِ جد و جہد ہوئے تو انہوں نے ایک دن مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ تحریک جسے لے کر ہم اٹھے ہیں، تمہارے لئے تقاضائے دین ہے، اس میں ہمارا مقابلہ تین محاذوں پر ہوگا ـــــ انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء ـــــ جو "قال اللہ و قال الرسولؐ" کے پردے میں اس تحریک کی مخالفت کریں گے۔ پہلے دونوں دشمنوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تیسرا محاذ تم سنبھال لو۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

اور اس طرح اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا۔ اُس وقت گنتی کے دو چار علماء کرام کے سوا، باقی سب اس تحریک کے مخالف تھے ـــــ (مولانا) ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ، ان کے سرخیل تھے اور ان کے علم و فضل کی دھاک، ہندوستان ہی میں نہیں، تمام عالمِ اسلام میں بیٹھی ہوئی تھی ـــــ یہ سب ایک طرف تھے اور طلوعِ اسلام تنہا دوسری طرف۔ اس نے اُن کی یورشوں کا مقابلہ کس جرأت سے کیا اور انہیں ہر میدان میں کس طرح عبرت آموز شکست ہوئی، اس پر اُس زمانے کے طلوعِ اسلام کے فائل شاہد ہیں۔ مابہ النزاع مسائل دو ہی تھے۔ یعنی:-

(۱) اُن کا دعویٰ تھا کہ ایک ملک یا مملکت کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ـــ ہندو اور مسلم ـــ مل کر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اس قوم کی اپنی مملکت ہوتی ہے اور اپنی حکومت۔

اس کے برعکس، ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے، معیارِ قومیت، حسب نسب، رنگ، خون، وطن یا مملکت کا اشتراک نہیں، بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ مسلمان، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بستے ہوں، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور غیر مسلم، خواہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں، دوسری قوم۔ اس نظریۂ قومیت کی رو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اسے دو قومی نظریہ یا (TWO NATION THEORY) کہا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

---

[1] جمعیت العلماء ہند کے ممتاز ارکان۔

(۲) دوسرا نکتۂ اختلاف یہ تھا کہ نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ جب ہندوستان کے ہندو اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں، مسلمانوں کے عقائد و عبادات اور شخصی قوانین پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی، تو پھر ہمیں الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام، عقائد و عبادات اور شخصی قوانین ہی کا نام نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اور جب تک زندگی کے ہر شعبے پر احکام و قوانینِ خداوندی کی حکمرانی نہ ہو، نہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد تصور کر سکتا ہے، نہ قرآنی مومن نیشنلسٹ علماء کا یہی مسلک تھا جس پر تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارے ان دونوں دعاوی کا نام نظریۂ پاکستان تھا۔ دس برس تک، قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء، مسلسل اور پیہم ان دعاوی کو دہراتے رہے۔ یعنی یہ کہ اسلام کی رُو سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور مسلمان، صحیح اسلامی زندگی بسر کر نہیں سکتے

آزادی کی پہلی عید

جب تک ان کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ دس برس کی مسلسل جنگ کے بعد، بفضلِ ایزدِ متعال، پاکستان وجود میں آگیا۔ اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو، اس کے یومِ تاسیس کے تین دن بعد، ہم نے اپنی آزاد مملکت میں پہلی نمازِ عید ادا کی ——— وہ عید جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں   عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت بھی غم و آلام کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ ہندو نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں، مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے، بخاک و خون غلطیدہ، اس نوزائیدہ مملکت کی ذمہ داری بن رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، ہم نہ افسردہ تھے نہ پژمردہ۔ اس لئے کہ اگر آخرِ شب کے یہ جھلملاتے ہوئے چراغ گل ہو رہے تھے تو سامنے پاکستان کے مستقبل کا آفتابِ جہاں تاب، ضوفشانیوں کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے اُبھرتا نظر آ رہا تھا اور افق کے اس پار سے' یہ نویدِ جانفزا، باعثِ صد تسکین اور وجہ ہزار تسلّی ہو رہی تھی ——— کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

پاکستان کا تصوّر دینے والا اقبالؒ اس سے نو سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اسے عملاً متشکل کرنے والا قائداعظمؒ ایک سال بعد اپنے رفیق سے جا ملا۔ اور اس کے بعد، دنیا نے بصد حیرت و استعجاب یہ تماشہ دیکھا کہ جس بنیاد پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی، اس قوم نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالا ——— كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا۔ (۱۶/۹۲) "اُس بڑھیا کی طرح جس نے دن بھر بڑی محنت اور مشقت سے سوت کاتا اور شام کو اسے خود اپنے ہاتھوں ادھیڑ دیا" ——— اور تعجب بالائے تعجب کہ ساری قوم ہی اس ادھیڑنے کے شغل میں مصروف ہو گئی۔

زوال کی ابتدا

(معاف فرمائیے) اس "پاگل خانے" میں طلوعِ اسلام کی ایک آواز تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ارے دیوانو! سوچو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا؟ انہوں نے ایک طرف پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا اور اس طرح دو قومی نظریہ کا خود ہی ابطال کر دیا۔ پھر انہوں نے صوبائی تفریق اور بنگال، پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچ کے امتیاز کی گرہیں مضبوط کر کے ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ کے تصوّر کو ملیامیٹ کر دیا۔ باقی رہا دوسرا دعویٰ (یعنی یہ کہ یہ مملکت اس لئے حاصل کی گئی ہے کہ ہم یہاں قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں) سو اُسے

"اسلام کے اجارہ داروں" نے عملاً ناممکن بنا دیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مملکت کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا"۔ اور طلوع اسلام نے انہیں متنبہ کیا کہ یاد رکھو! کتاب وسنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر ضابطۂ قوانین مرتب کرو۔ اس پر انہوں نے طلوع اسلام کو منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ اور اپنے اسی مطالبہ کو دہراتے رہے۔ بالآخر انہیں تئیس برس کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب وسنت کی بنیادوں پر فی الواقعہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (ملاحظہ ہو مودودی صاحب کا بیان شائع شدہ ایشیا مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء) لیکن اتنے میں ہماری نئی نسل، یہ سمجھ کر کہ اسلام اب ناممکن العمل ہو چکا ہے، سیکولر حکومت کے تصور پر آ چکی تھی۔ مطالبۂ پاکستان کے دونوں ستون یوں منہدم ہو گئے ——— تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے۔

چار قوموں کا نظریہ

بنگالی۔ پٹھان۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچ کے امتیاز نے جداگانہ قومیتوں کے جراثیم کی پرورش کی اور علماء حضرات کے اس ناممکن العمل مطالبہ اور باہمی سر پھٹول نے سیکولر حکومت کے تصور کو عام کیا۔ اس طرح پاکستانی مسلمانوں میں کوئی شے وجہِ اشتراک نہ رہی۔ اس کا پہلا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رونما ہوا۔ اور اب وہی رَو مغربی پاکستان میں چل رہی ہے۔ یہاں ۱۹۶۸ء میں یہ آواز بلند ہوئی (اور اس پر فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی قسم کے لوگ پیش پیش تھے) کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں چار قومیں بستی ہیں۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۲) یہ آواز بڑی خطرناک تھی اور پاکستان کو ختم کر دینے کا نہایت مؤثر حربہ۔ اس لئے کہ جب آپ کسی قوم کا الگ وجود تسلیم کرا لیتے ہیں تو اس کے بعد اس کے جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد بھی تو اسی دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ جونہی ہم نے اس دعویٰ کو تسلیم کرا لیا، پاکستان کی جداگانہ مملکت کا مطالبہ ناقابلِ استرداد ہو گیا۔ لیکن جب آپ ایک قوم کی جگہ متعدد اقوام کا وجود تسلیم کر لیں، تو جداگانہ مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ پاکستان میں چار قومیتوں کا نظریہ، اس مملکت کے جداگانہ وجود کو ختم کرنے کا قدمِ اوّل تھا۔ "چار قوموں" کا یہ سنپولیا خاموشی ہی خاموشی میں پرورش پاتا چلا گیا تا آنکہ اب یہ خطرناک اژدہا بن کر پھنکارتا پھرتا ہے۔ سرحد میں یہ بات عام ہو چکی ہے۔ جی۔ ایم۔ سیّد مُصر ہے کہ سندھیوں کو الگ قوم تسلیم کیا جائے۔ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل کا یہ بیان ابھی حال ہی میں (۲۷ جولائی ۱۹۷۲ء کے نوائے وقت میں) شائع ہوا ہے کہ "نیشنل عوامی پارٹی بچے کھچے پاکستان میں چار اقوام کی موجودگی کی قائل ہے"۔

اتنا ہی نہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں سیکولر حکومت قائم ہوگی ——— اور یہ بات نئی نہیں۔ اسے آج سے بہت پہلے بلند کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں، پاکستان کے (سابق) چیف جسٹس، منیر صاحب نے پاکستان ٹائمز میں ایک مبسوط مقالہ لکھا، جس کا عنوان تھا (DAYS TO REMEMBER) اس کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ:۔

> تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔

جسٹس منیر صاحب کے تتبع میں، ہماری نئی نسل کے ایک نوجوان نے، اسی اخبار کی ۱۱ جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

> پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی، اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔ (طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۶۴ء)

یہ کہتے ہوئے ہمارے اس عزیز کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ اس سے وہ بانیٔ پاکستان کے خلاف ایسا الزام عائد کر رہا ہے جس کی جرأت ان کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی نہ ہوئی تھی۔ (یہ ضمنی بات تھی)۔ پہلے یہ آواز دبی دبی سی اٹھ رہی تھی، لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اب اس کا الاپ نہایت اونچے سروں میں شروع ہو گیا ہے۔ میں اس مقام پر اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کوئی صاحب ہیں پروفیسر احمد حسن دانی۔ ان کا ایک طویل مقالہ (بعنوان پاکستان بیئنگ تھٹ) جریدۂ پاکستان ٹائمز کی ۱۸ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> پاکستانی قومیت کی بنیاد اسلام کی روحانی اقدار نہیں کیونکہ اسے اسلام کے کسی فلسفہ کی سند حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد وہ تاریخی عوامل ہیں جن سے یہاں کے مسلمان دوچار تھے۔

شیخ حامد محمود صاحب پاکستان کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کا ایک مبسوط مقالہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۲۶ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب صدر بھٹو مذاکرات کے لئے شملہ تشریف لے جا رہے تھے۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کی بھی وضاحت کر دی جائے کیونکہ یہ بات بڑی شد و مد سے کہی جا رہی ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے دو قومی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی کے متعلق سادہ سے الفاظ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ پاکستان میں اسلامی مملکت یا تھیاکریسی یا "پان اسلامک" سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا منطقی نتیجہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد ہرگز نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد، دو قومی نظریہ ہے۔ سادہ الفاظ میں دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں تھے انہیں ہندوستان سے الگ کر لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے تغلب سے آزاد کرا لیا جائے۔ دو قومی نظریہ کے لئے پہلے ایک غیر قوم —— یعنی ہندوؤں —— کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اطلاق کسی اور مسلم اقلیت پر نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں، اگرچہ یہ کہنا ممکن یا مناسب نہ ہو گا لیکن ہو گا یہ بالکل منطقی اور جائز کہ ہندوؤں سے علیحدگی کے بعد، ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق بلکہ جنوبی ہند میں، مسلمانوں کی دو، تین یا پانچ مسلم ریاستیں ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ:-

> اگر پاکستان کی آئیڈیالوجی سے مراد ایک اسلامی مملکت کا قیام ہے جیسا کہ بعض لوگ نہایت شد و مد اور حتم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں، تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں کسی اور اسلامی مملکت، مثلاً افغانستان یا ایران کے اندر مدغم ہو جانا چاہیے[1]۔

میں ان طویل اقتباسات کے لئے سامعین سے معذرت خواہ ہوں۔ اگرچہ مقالہ نگار کا اسلوبِ بیان بڑا الجھا ہوا سا ہے لیکن

---

[1] انہیں کون بتائے کہ قرآنی اسلام کی رو سے تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں اور ان کی ایک ہی مملکت۔ ہمارے صدرِ اوّل میں یہی حالت تھی۔

مجھے امید ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، سامعین اُسے سمجھ گئے ہوں گے۔

دو الگ مملکتیں

بنگلہ دیش کی علیحدگی کے سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کے سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں، پاکستان کے شمال جنوب اور شمال مشرق میں دو جداگانہ آزاد مملکتوں کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس لئے اگر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا ہے تو یہ قرار دادِ لاہور کے عین مطابق ہے۔ واضح رہے کہ دو آزاد مملکتوں کا یہ شوشہ پہلے مولانا بھاشانی نے چھوڑا تھا۔ پھر اسے شیخ مجیب الرحمٰن نے اُبھارا۔ اور اب اسے یہاں بھی عام کیا جا رہا ہے۔

مسلم لیگی راہ نمایانِ کرام

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ بھانت بھانت کی بولیاں جو اس وقت نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ کے متعلق یہاں بولی جا رہی ہیں۔ ——— ان حالات کے ماتحت' میں نے ضروری سمجھا ہے کہ کم از کم اتنا تو بتا دیا جائے کہ قائدِ اعظمؒ اس باب میں کیا کہا کرتے تھے۔ مجھ پر یہ ذمہ داری ایک تو اس لئے عائد ہوتی ہے کہ، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے' مملکتِ پاکستان کا تحفظ میرا جزوِ ایمان ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ مجھے قریب دس سال تک قائدِ اعظمؒ کے قُرب کی سعادت حاصل رہی ہے۔ کل روزِ قیامت اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے سامنے میرے خلاف اس قسم کے الزامات تراشے جاتے تھے۔ میں اپنی مدافعت کے لئے وہاں موجود نہیں تھا۔ تم ابھی زندہ تھے اور سب کچھ تمہارے علم میں بھی تھا۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ حقیقتِ حال لوگوں پر واضح کر کے میری پوزیشن صاف کر دو، تو میں ان کے اس سوال کا جواب کیا دوں گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ہم میں اس دور سے متعلق ایسے لوگ موجود ہیں جو ان سوالات کا جواب مجھ سے بھی بہتر طریق پر دے سکتے تھے لیکن ان کی جو کیفیت ہے اسے بیان کرنے سے میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے، پاکستان ٹیلی ویژن نے، تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والے بعض نامور مشاہیر کو بلایا تھا کہ وہ بتائیں کہ مطالبۂ پاکستان کا بنیادی محرک کیا تھا۔ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے چوہدری خلیق الزمان، مسٹر حسین امام، راجہ محمود آباد۔ شاہ عزیز الرحمٰن جیسے بزرگ ٹیلی ویژن پر تشریف لائے اور انہوں نے جو کچھ فرمایا' مجھے یقین ہے کہ اسے سُن کر قائدِ اعظمؒ کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔ انہوں نے وہی کہا تھا جسے نظریۂ پاکستان کے مخالفین کی طرف سے دہرایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اُن سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر وہ ذرا کشادہ دلی سے کام لیتا اور ہمارے معاشی استحصال سے باز آجاتا تو ہم کبھی جداگانہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ ؎

زگلفروش نالم کز اہلِ بازار است
تپاکِ گرمیٔ رفتارِ باغبانم سوخت!

قائدِ اعظمؒ کے ارشادات

لہٰذا عزیزانِ من! یہ قرعۂ فال اس دیوانے کے نام ہی پڑا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس سلسلہ میں کیا کہا تھا۔ یعنی اس سلسلہ میں کہ:

(۱) کیا مطالبۂ پاکستان سے مقصود ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا یا محض ہندو کے معاشی استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنا۔

(۲) کیا دو قومی نظریہ اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے۔ یا اسے محض ایک حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔

اور —— (۳) قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر ایک پاکستان کا تصور تھا یا دو الگ مملکتوں کا۔

اس سلسلہ میں، میں ان باتوں کا تذکرہ بالکل نہیں کروں گا جو دس سالی کی ملاقاتوں میں قائدِ اعظمؒ کے ساتھ زبانی ہوتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کی سند کوئی نہیں ہوتی۔ میں صرف قائدِ اعظمؒ کی ان تقاریر اور بیانات کے اقتباسات پیش کروں گا جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر، وہ دو جلدیں سرِفہرست ہیں جنہیں شیخ محمد اشرف، پبلشر لاہور نے شائع کیا تھا۔ حوالے کے لئے، جلد اوّل کا ۱۹۵۲ء کا اور جلد دوم کا ۱۹۴۷ء کا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ (بغرض سہولت میں ان کے صفحات تک کا بھی حوالہ دیتا جاؤں گا)۔

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ قائدِ اعظمؒ کی سیاست، معاشی یا سیاسی مقاصد پر مبنی تھی یا اس میں مذہب کو بھی کوئی دخل تھا؟ قائدِ اعظمؒ کا حریفِ اوّل (مہاتما) گاندھی تھا۔ اس نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں کہا کہ:-

سیاست اور مذہب

> آج آپ (یعنی مسٹر گاندھی) اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے، وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ "وہ خالص مذہبی جذبہ ہے"۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے)۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی۔ اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پرستی بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔
>
> (تقاریر ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۴۰ ۔ ۱۳۹)

میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر سوال کے جواب کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہوگا لیکن چونکہ بات اجمال سے نہیں بنے گی اس لئے میں اس کی تفصیل بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

اسلام ۔ اسلام اور صرف اسلام

(۱) قائدِ اعظمؒ نے، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۹ء کو، ریڈیو پر، قوم کے نام، 'پیغامِ عید' نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا:-

> معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی۔ اسے آخر الامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم' اسلام اور روحِ اسلام ہے۔ (تقاریر ۔ جلد اوّل ۔ ص۱۰۱)

(۲) مارچ ۱۹۴۴ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے، قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ ذات برادری کی تقسیم، اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دے گی۔ ان تفریقات کو ختم کر دیجئے۔ یاد رکھیئے:-

ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد، اسلام ہے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۸۹)

(۳) انہوں نے، ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

(سوال یہ ہے کہ ہم جس آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے حصول کے لئے ہمارے پاس قوت کونسی ہے)۔ ہماری وہ قوت، ہمارا مذہب، ہماری ثقافت اور اسلامک آئیڈیلز ہے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۲۳۸)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، اپنے پیغام عید میں قوم سے کہا:۔

یاد رکھئے، اسلام صرف روحانی احکام اور نظریات، یا مذہبی رسوم و مراسم کا نام نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی معاشرے کے ہر گوشے کو محیط ہے ۔۔۔۔ خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو اور خواہ حیاتِ اجتماعیہ سے۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۳۰۱)

یہ تو رہا اسلام کی عمومی حیثیت کے متعلق۔ اب آیئے اس سوال کی طرف کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے

(۵) ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس سے، خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی۔ اپنے ثقافتی نشو و نما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر - حصہ دوم - ص ۲۳۳)

(۶) اسی حقیقت کو انہوں نے، اُسی ماہ، اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے دہرایا:۔ (ایضاً ص ۲۵۱)

(۷) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور کے طلباء کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

ہم، ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے آئیڈیلز کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندو لیڈرشپ، رام راج قائم کرنا چاہتی اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی ہے۔ (تقاریر - حصہ دوم - ص ۲۴۶)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ یہ ہندو کا معاشی استحصال تھا جس نے ہمیں مطالبۂ پاکستان پر مجبور کیا تھا یا اُن کا یہ منصوبہ کہ مسلمان اسلام کے مطابق نہیں بلکہ رام راج کے تابع زندگی بسر کریں! اس سلسلہ میں قائداعظم جانے ہ

(۸) پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلامک اسٹیٹ

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آ گیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آ گیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔ (تقاریر - جلد دوم - ص ۹۵)

(۹) یہاں قائداعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کو وہ مسلم اسٹیٹ کہا ہے جو اسلام کے صدرِ اوّل کی عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ (دہلی) ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے خطاب میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ بہت سے فتنے برپا کئے جاتے ہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی؟ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آئے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا سوال کرنے والے ہمارے خلاف . . . . (VOTE OF CENSURE) پاس کرتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۵۵)

(۱۰) پاکستان کو اس قسم کی اسلامی مملکت بننا تھا جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔ چنانچہ یومِ اقبال منعقدہ دسمبر ۱۹۴۴ء کے سلسلہ میں پیغام دیتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا کہ:۔

اسلامی نظریاتِ زندگی پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اقبالؒ ان معدودے چند مشاہیر میں سے تھا جنہوں نے اس امکان کو روشن کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں جو مسلمانوں کے تاریخی امکن ہیں، ایک اسلامک اسٹیٹ قائم کی جا سکتی ہے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۲)

(۱۱) قائداعظمؒ نے، اس آواز کو، کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی، ہندوستان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اسے مغربی ممالک تک میں عام کر دیا۔ انہوں نے ۸ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں بتایا:۔

پاکستان ایک مسلم اسٹیٹ ہوگی۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۶)

انہوں نے، لندن میں، مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو فرمایا کہ:۔

ہم ایک ایسی آزاد مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصوراتِ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۵۰۳)

میں پوچھنا چاہتا ہوں برادرانِ گرامی قدر! کہ کیا ان اقتباسات کے بعد اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آ سکتی ہے کہ قائداعظمؒ کے نزدیک پاکستان کا مقصد کیا تھا اور وہ اسے ایک اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے تھے یا سیکولر اسٹیٹ!

اگر اسلام کو مٹنے سے بچانا چاہتے ہو تو . . . .

اگر ان کے اس قدر اعلانات بھی ناکافی ہوں تو ان میں دو ایک ایسے بیانات کا اضافہ کر لیجیے جن میں انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ اگر تم اس حصۂ ارض پر اسلام کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کے لئے قیامِ پاکستان کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ انہوں نے ——————

(۱۲) دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ، ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی، واحد نصب العین (GOAL) ہے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۹۶)

(۱۳) پھر انہوں نے، ۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو، پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ (یاد رکھو) اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی

نہیں رہے گا۔ (تقاریر - جلد دوم - صفحہ ۲۵۵)

حصولِ پاکستان کے بعد

(۱۴) اب آئیے اپنے اس گم کردہ غلط بیں نوجوان کی طرف جس نے کہا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی اصلی بنیاد تو معاشی تھی لیکن اسے مذہب کا نقاب اس لئے اوڑھا دیا گیا کہ یہ عوامی جذب جذبہ بن سکے! اس مفروضہ کے ماتحت، اس نقاب کی ضرورت، حصولِ پاکستان سے پہلے تک تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد تو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن دیکھئے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائدِ اعظمؒ کیا کہتے رہے تھے۔ انہوں نے آزادیٔ پاکستان کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر، ۱۴ر اگست ۱۹۴۸ء کو بہ حیثیتِ گورنر جنرل آف پاکستان، قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ:۔

> پاکستان کا قیام ایک ایسا محیر العقول واقعہ ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم اسٹیٹس میں سے ایک ہے۔ (گورنر جنرل کی حیثیت سے تقاریر کا مجموعہ صفحہ ۱۵۷)

یہ ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا:۔

(۱۵) انہوں نے، گورنر جنرل کی حیثیت سے، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالقدینا ہال، کراچی میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جا سکیں۔ (ایضاً - صفحہ ۲۲)

تھیاکریسی نہیں

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قائدِ اعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیتے تھے تو وہ اس خطرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے جو اس مملکت کو "مذہب کے اجارہ داروں" کی طرف سے لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت پہلے وارننگ دی تھی۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کا کنونشن منعقدہ ہوا۔ اس کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے! یاد رکھئے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (تقاریر - جلد دوم - صفحہ ۳۸۶)

انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا:۔

> پاکستان کا نسٹی ٹیوٹنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ

بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر۔ بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۵) یہی بات انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو اہلِ آسٹریلیا کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہی تھی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۸)

* * *

قرآنِ عظیم

یہاں سے عزیزانِ من! ایک اہم سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ قائدِاعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت بھی بنانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس میں، زمامِ اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ تو پھر وہ، اس اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ اور آخری اتھارٹی کسے قرار دینا چاہتے تھے؟ قائدِاعظمؒ نے اس باب میں بھی اپنے خیالات نہایت وضاحت سے بیان فرما دیئے تھے جو ہماری نئی نسل اور قدامت پرست دونوں طبقوں کے لئے دلیلِ راہ بننے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں غور سے سنئے:۔

(۱) اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِاعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

> تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۱۶)

(۲) ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فسادات ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا کہ:۔

> جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۰۸)

(۳) دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

> وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتابِ عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
>
> ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول۔ فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملّت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہِ بصیرت ہمیشہ وجد

کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

> اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحرِ اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:۔

> اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ——— ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں)۔
>
> (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳)

یہ تھا وہ مکمل، غیر متبدل، ضابطہ جسے اس مملکتِ اسلامیہ کے لئے سرچشمۂ قوانین و ہدایت قرار دیا جانا مقصود تھا۔

جامع ملخص

اسلامی مملکتِ پاکستانیہ کی اساس و ضوابط کے متعلق جو کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے، آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ میں ان کا جامع ملخص بھی آپ کے سامنے پیش کردوں۔ لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اس تفصیل کو خود قائدِ اعظمؒ نے دو تین سوالات کے جواب میں، اس حسن و خوبی سے سمو دیا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہوا یہ کہ آپ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوالات، اور قائدِ اعظمؒ کی طرف سے دیئے گئے ان کے جواب، اورینٹ پریس آف انڈیا نے نشر کئے اور اس زمانے کے روزنامہ انقلاب (لاہور) نے شائع کئے۔ آپ بھی بغور سن لیجئے۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION)؎ کا لفظ سنتا ہوں تو اُس زبان اور محاورے کی رُو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ

؎ ہمارے ہاں دقّت یہ پیش آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کے لئے دین کا لفظ آیا ہے۔ اور لفظ دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ ان کے ہاں صرف (RELIGION) کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب ہیں۔ دین نہیں۔

کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت یا بالشویت یا اسی قسم کے دیگر معاشی و سیاسی مسالک درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط و تناسب نہیں پایا جاتا۔

اب دیکھئے وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب جو ہمارے نزدیک اس نظمِ مرصع کا مقطع کا بند ہے۔ سوال یہ تھا کہ:۔

اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یہ ہے عزیزانِ من! — **نظریۂ پاکستان** — اور یہ کچھ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں فرمایا تھا۔

یہ تھے قائدِ اعظمؒ کے ارشادات اس باب میں کہ پاکستان کی مملکت کس قسم کی ہوگی۔ ان کی موجودگی میں یہاں ایسے بزرجمہر ہیں جو یہ خیال عام کرتے رہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کسی کے ذہن تک میں نہیں تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ نہ ہی اس تحریک کے قائدین کو اسلام کی ہوا تک بھی لگی تھی۔ ان حضرات کو تو اس کا علم نہیں تھا کہ قائدِ اعظمؒ نے کبھی اسلام کا نام لیا تھا یا نہیں — لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا علم تھا تو کسے تھا؟! اسے بھی غور سے سنئے۔ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت، ہندوؤں کے مشہور راہنما مسٹر منشی (آنجہانی) نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کو ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے اماکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختلف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔
>
> (ٹریبیون - ۲ نومبر ۱۹۴۱ء)

(۲) ۱۹۴۰ء میں ایک دفعہ یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرلیں۔ اس پر کانگریس کے ایک بلند پایہ لیڈر، مسٹر ستیہ مورتی نے کہا کہ:۔

> کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں کس طرح قائم کرسکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔
>
> (ہندوستان ٹائمز - ۱۱-۶-۴۰)

یہ بات قرار داد لاہور کے تین ہی ماہ بعد کی ہے۔

ایک مملکت

اس مقام پر یہ بھی دیکھتے جائیے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی بازوؤں میں دو الگ الگ آزاد ریاستوں کا تصور دیا تھا یا انہیں ایک ہی مملکت کے دو اجزائے لاینفک قرار دیا تھا۔ انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:

> جغرافیائی حیثیت سے، پاکستان، مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا۔ اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصہ ہوں گے۔ پاکستان کے ان اجزاء کو اس کے صوبے یا (STATES) کہہ لیجئے۔ پاکستان بہر حال ایک مسلم اسٹیٹ ہوگا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۵-۲۶)

(۲) انہوں نے ۲۳ مئی ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کے سلسلہ میں، بیان دیتے ہوئے کہا:

> مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان مل کر ایک آزاد، خود مختار مملکت بنیں گے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۹)

(۳) انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں اعلان کیا تھا کہ "ہم ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں"۔ (ایضاً۔ ص ۵۰۳)۔

(۴) تشکیل پاکستان کے بعد، وہ اس مملکت کے گورنر جنرل بنے جو مشرقی اور مغربی دونوں حصّوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو باشندگان آسٹریلیا کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا کہ:

> پاکستان دو قطعات (BLOCKS) پر مشتمل ہے۔ ایک شمال مغرب میں واقعہ ہے اور دوسرا شمال مشرق میں۔ (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ ص ۵۶)

(۵) پھر انہوں نے، اسی ماہ، اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں فرمایا:

> پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی محسوس تعبیر ہے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت، اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے جغرافیائی اعتبار سے یہ دو حصوں میں منقسم ہے ـــــ ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ ان دونوں میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ مغربی پاکستان، سرحد، مغربی پنجاب، سندھ، اور بلوچستان پر مشتمل ہے جس کا رقبہ (۱,۷۹,۰۰۰) مربع میل ہے، اور مشرقی پاکستان مشرقی بنگال اور ضلع سلہٹ پر مشتمل۔ اس کا رقبہ (۵۴,۰۰۰) مربع میل ہے۔ پاکستان کا کل رقبہ (۲,۳۳,۰۰۰) مربع میل اور آبادی قریب سات کروڑ ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۳)

فرمائیے! ان شواہد کے بعد یہ سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی بھی ضرورت رہ جاتی ہے کہ قائداعظمؒ کے نزدیک پاکستان سے مراد ایک آزاد مملکت تھی، یا مشرق اور مغرب میں دو آزاد مملکتیں!

دو قومی نظریہ

ایک ابدی صداقت

اب میں عزیزانِ من! اس سوال کے تیسرے، اور بنیادی حصّہ کی طرف آتا ہوں۔ یعنی دو قومی نظریہ کی طرف۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ "دو قومی نظریہ" سے مراد اتنی ہی نہیں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں بستی تھیں۔ "دو قومی نظریہ" اسلام کی بنیادی تعلیم اور ایک ابدی صداقت ہے جس کا اعلان اس دن ہوا، جب خدا کے پہلے رسول، حضرت نوحؑ نے، سب سے پہلی مرتبہ، دینِ خداوندی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد ہر رسول اس صداقت کو دہراتا رہا۔ تاآنکہ اسے قرآنِ کریم کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ وہ ابدی صداقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان، دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے (اور یہ وحی اب صرف قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہے) اور دوسرا گروہ وہ، جو اس نہجِ زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ - فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ - (۶۴/۲) "خدا وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے، اور کچھ مومن بن گئے"۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ قوم جو اس ایمان کی رو سے وجود میں آئے اور دوسری ان کی جو ان میں شامل نہ ہوں۔ اس سے واضح ہے کہ جس طرح یہ تصوّر اسلام کے خلاف ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، اسی طرح یہ مسلک بھی یکسر خلافِ اسلام ہے کہ مسلمان رنگ، نسل، زبان، اور وطن کے، اختلاف سے مختلف قوموں میں بٹ سکتے ہیں۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں۔ یہ اس دین کا اساسی جزو ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمایا تھا۔ اقبالؒ نے بھی اس نظریہ کو پیش کیا تھا، تخلیق نہیں کیا تھا۔

عالمگیر اُمّت اور مملکت

صدرِ اول میں اسی نظریہ کی بنا پر دو قوموں کا وجود عمل میں لایا گیا ——— ایک امتِ مسلمہ (یعنی تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم) اور دوسری ملّتِ کافرہ (یعنی تمام غیر مسلم، دوسری قوم) امتِ مسلمہ ایک (واحد) قوم تھی اور اس کی مملکت بھی ایک تھی اور ضابطۂ آئین و قوانین بھی ایک۔ یعنی قرآنِ مجید ——— لیکن کچھ عرصہ کے بعد، جب مسلمانوں کی گاڑی اسلام کو چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو اُمّتِ مسلمہ (یعنی مسلمان قوم) رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف سے الگ الگ قوموں میں بٹ گئی۔ اور ان کی مملکتیں بھی الگ الگ قائم ہو گئیں۔ اور قرآنِ کریم ان کا ضابطۂ حیات بھی نہ رہا۔ مسلمانوں کو اس غیر اسلامی نہجِ زندگی پر صدیاں گزر گئیں تاآنکہ علامہ اقبالؒ نے صدرِ اوّل کے صحیح اسلام کا تصوّر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا، اور چاہا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل ہو جائے جس میں اس تصوّر کو عملاً متشکل کر کے احیاءِ اسلام کی تحریک کا آغاز کر دیا جائے اِس تجربہ کے بعد یہ سلسلہ آگے پھیلتا جائے جس سے رفتہ رفتہ تمام دنیا کے مسلمان پھر سے امتِ واحدہ (ایک قوم) بن جائیں اور ان کی ایک مرکزی قوت قائم ہو جائے جس کا نقطۂ ماسکہ قرآنِ کریم ہو۔ حامد محمود صاحب نے جو کہا ہے کہ اگر ایمان کے اشتراک کی بنا پر قومیت کی تشکیل کا اصول صحیح ہے تو پھر پاکستان کو کسی اسلامی مملکت (مثلاً افغانستان۔ ایران) کے ساتھ مدغم ہو جانا چاہیئے تو یہ بات اپنی اصل کی رو سے بالکل درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ (اوّل تو) پاکستان

کو حقیقی اسلام کی تجربہ گاہ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ابھی تک اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ اور دوسرے یہ کہ اِس وقت دنیا میں اسلامی مملکت کوئی بھی نہیں۔ سب مسلمانوں کی قومی مملکتیں ہیں۔ مسلمانوں کی مملکتیں اگر (اور جب) اسلامی بن جائیں گی تو ان کے رہنے والے مسلمان سب ایک قوم کے افراد ہوں گے اور ان مملکتوں کا ضابطۂ قوانین و سرچشمۂ آئین بھی ایک ہی (یعنی قرآن کریم) ہوگا —— اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام مملکتیں ایک ہی مملکت میں مدغم ہو جائیں۔ موجودہ زمانے میں جب سلسلۂ مواصلات اس قدر عام اور سامانِ رسل و رسائل ایسا بافراط ہوگیا ہے، اس قسم کی عالمگیر مملکت کا قیام کچھ بھی مشکل نہیں رہا۔

یہ بہرحال بعد کی بات ہے۔ ہم نے اس تجربہ کی ابتداء کرنے کے لئے، پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہمارا پہلا مطالبہ، مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل نہیں بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کرانا تھا کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، ہندوستان کے غیرمسلموں سے الگ، مستقل بالذات، قوم ہیں —— قائداعظمؒ سے اس کی بابت پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ اگر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کرا لیا گیا تو ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس لئے یہاں سب سے پہلے اس بنیادی مطالبہ پر زور دینا چاہیئے۔ خود رسول اللہؐ نے بھی پہلے ایک (جداگانہ) اُمت کی تشکیل فرمائی تھی۔ مملکت اس کے پیچھے پیچھے خود آگئی تھی۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ قائداعظمؒ اس مطالبہ کو کس طرح بااصرار و تکرار پیش کرتے گئے تھے۔

(۱) قائداعظم نے اس مطالبہ کا آغاز ایک ایسی حقیقت سے کیا، اور اسے ایسے انداز میں پیش کیا جو جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے ۸ر مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

مذہب کی بنیاد پر دو قومیں

> پاکستان کا آغاز تو اس دن ہوگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیرمسلم، اسلام قبول کرکے مسلمان ہوا تھا، حالانکہ اُس وقت ہنوز مسلمانوں کی کوئی حکومت یہاں قائم نہیں ہوئی تھی۔ جونہی کوئی ہندو مسلمان ہوتا، ہندو اسے مذہباً ہی نہیں بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حیثیت سے بھی اپنی برادری سے خارج کر دیتے (اور اس طرح اس کی پہلی قومیت ختم ہو جاتی) جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اسلام نے ان پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ کسی دوسری قومیت میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ (اس طرح یہاں دو قومیں وجود میں آتی چلی گئیں) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قصبہ اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہوسکے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ قوموں کی حیثیت سے رہتے چلے آرہے ہیں۔ (تقاریر۔ حصہ دوم۔ صـ ٦٤)

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہوئے۔ ایک قوم میں مدغم ہونا تو ایک طرف ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھا (اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وہ گروہ جس نے ہندوؤں میں اس خیال کو عقیدہ کی حیثیت سے ابھارا کہ مسلمان اچھوت ہیں، بڑی دور رس اور گہری سیاسی نگاہ رکھتا ہے۔ اس سے ہندو اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھ سکے۔) مسٹر گاندھی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ہندو اور مسلمان نہ کبھی ایک قوم بنے ہیں، نہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔

اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جونہی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تسلیم کیا گیا، ان کا جداگانہ مملکت کا مطالبہ تسلیم کرنا، ناگزیر ہو جائے گا۔ آپ دیکھئے کہ وہ قائدِ اعظمؒ کے اس دعویٰ پر، کہ مسلمان بہ بنائے مذہب ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں، کس طرح تلملا اٹھے تھے۔ انہوں نے (مسٹر گاندھی نے) ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا:-

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں — اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(۲) پاکستان کا ریزولیوشن، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت کے دوران قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:-

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔
>
> (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۷۸ - ۱۷۷)

(۳) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔
>
> (تقاریر۔ جلد دوم۔ صـ۲۴۶)

(۴) انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء کو احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> ہم میں اور ہندوؤں میں کوئی بھی تو قدر مشترک نہیں۔ مذہب کو چھوڑیئے۔ ہم میں معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں بھی کوئی اشتراک نہیں۔
>
> (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۵۴ و ۲۳۹)

پھر انہوں نے پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ ۲ مارچ ۱۹۴۱ء میں اسی حقیقت کو دہرایا۔ (ایضاً)

(۵) انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں کہا کہ:-

> ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ بھی تو ایسا نہیں جس میں ہم دونوں متفق ہوں۔
>
> (تقاریر۔ جلد دوم۔ صـ۵۰۳)

(۶) انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:-

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۸)

الگ قوم، الگ مملکت

(۷) اور اسی جداگانہ قومیت کے دعویٰ کی بنا پر انہوں نے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سنہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں یہ کہہ کر اس کی بنیاد رکھ دی تھی کہ "مسلمان، قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے، ایک الگ قوم ہیں اور اس لئے ان کے بسنے کی جگہ بھی الگ ہونی چاہیئے" (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۸۱) پھر انہوں نے ۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کے لئے لامحالہ ایک الگ علاقہ چاہیئے۔ اگر قوم کا اپنا علاقہ (TERRITORY) نہ ہو، تو اس کے قوم قوم پکارنے کا فائدہ کیا ہے۔ ایک قوم خلا میں تو نہیں رہ سکتی۔ وہ ہوا میں نہیں بلکہ زمین پر رہتی ہے اسے زمین پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اس لئے اس کی اپنی مملکت ہونی چاہیئے۔
>
> اور یہی ہمارا مطالبہ ہے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۴۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے یکم فروری سنہ ۱۹۴۳ء کو اسماعیلی کالج، بمبئی میں اپنی تقریر کے دوران دہرایا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۱۳)

* * *

لالہ لاجپت رائے کا اعتراف

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ حقیقت، کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے اور اس مملکت کی حکومت قرآن پر مبنی اسلامی ہو گی، مخالفین تحریکِ پاکستان مسلمانوں کی سمجھ میں تو نہیں آتی تھی لیکن ہندو اسے خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں، میں نے مسٹر منشی کے خطبۂ صدارت اور مسٹر ستیہ مورتی کے بیان کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ یہی صورت "دو قومی نظریہ" کی بھی تھی۔ اسے نہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) سمجھتے تھے، نہ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) لیکن اسے ہندوؤں کے لیڈر خوب سمجھتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے، ایک کٹر "ہندو لیڈر" اور نظریۂ پاکستان کا شدید ترین دشمن تھا۔ اس نے، کانگریسی راہ نما، مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط لکھا تھا جس کا حوالہ قائدِاعظمؒ نے مسلم لیگ سیشن سنہ ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں دیا تھا۔ اس خط میں لالہ لاجپت رائے نے لکھا تھا:۔

> ایک اور بات جو کچھ عرصہ سے میرے لئے وجۂ اضطراب بن رہی ہے، ہندو مسلم اتحاد، کا مسئلہ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں۔ گزشتہ چھ ماہ میں، میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصّہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شئے ہے۔ وہ مسلمان راہ نما جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو بھی، میرے خیال میں، ان کا مذہب اس

کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا:

> آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا، جو اس باب میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہ نما قرآن کریم کے احکام پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے . . . . میں تہہ دل سے ہندو مسلمان اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے۔ مسلمان راہ نما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔
>
> (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صـ ۱۷۴-۷۵)

اس کے بعد بھی، کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ، جسے قائدِ اعظمؒ اس شدّ و مد سے پیش کرتے چلے آرہے تھے، قرآن و حدیث کے احکام پر مبنی تھا ——— قرآن و حدیث کے ان احکام پر جن پر، بقول لالہ لاجپت رائے، کوئی مسلمان خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔

* * *

تشکیلِ پاکستان کے بعد

کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے بے شک دو قومی نظریہ ہندوستان میں پیش کیا تھا۔ لیکن انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ۱۱ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی اسمبلی کی تقاریر میں کہہ دیا تھا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم ایک ہو کر رہیں گے اور اس طرح انہوں نے، دو قومی نظریہ پر خود ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیا تھا! اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس وقت (میں سمجھتا ہوں کہ) اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قائدِ اعظمؒ کی ان تقاریر کا مطلب ایک غیر مسلم نے کیا سمجھا تھا۔ مسٹر جوشوا فضل دین، مشہور عیسائی راہ نما ہیں[ھ]۔ انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا (RATIONALE OF PAKISTAN,S CONSTITUTION) اس میں انہوں نے، قائدِ اعظمؒ کی مذکورہ بالا تقاریر کے اقتباسات دینے کے بعد کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان سے قائدِ اعظمؒ کا یہ مقصد تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان مسلمان رہے، بلکہ ان کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا نتیجہ لازماً سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ایسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے ـــ جو خود پاکستان کے خالق تھے ـــ اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہو کہ پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔

اور کس قدر دور رس نگاہ تھی قائدِ اعظمؒ کی؟ انہوں نے جاتے جاتے ایک بار پھر واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت کے

[ھ] اب وفات پا چکے ہیں۔

بنیادی عناصر کیا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں پہلے یہ فرمایا کہ:-

معزبی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھریگا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ:-

ایسا، ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔
ایمان اپنے مستقبل پر۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

آخری وضاحت

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریمِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس و رجحان کے مالک ہیں۔ اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں)۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص۸۹)

ایمان۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔

یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور آج وہی ایمان باقی نہیں رہا۔ اور اسی کے باقی نہ رہنے سے ایک حصہ پاکستان ختم ہو چکا ہے اور دوسرے کی بقاء کیلئے ہم دعائیں مانگ رہے ہیں۔

* * *

مشرقی پاکستان کی علیحدگی نہ تو کوئی اتفاقی یا ہنگامہ حادثہ ہے اور نہ ہی (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) اس کے حقیقی ذمہ دار شیخ مجیب یا یحییٰ خان وغیرہ ہیں۔ مجیب اور یحییٰ خان یا ۱۹۷۱ء کے حادثات تو اس کے فوری اسباب

ہماری تباہی کے حقیقی اسباب

(IMMEDIATE CAUSES) ہیں۔ اس کی ابتدا قائداعظمؒ کی وفات کے فوری بعد ہو گئی تھی۔ جب (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر، اشتراکِ وطنیت کی بنا پر، ایک قوم تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح پاکستان کے دو ستونوں میں سے ایک کو خود ہی منہدم کر دیا۔ اس وقت سندھ اور مشرقی پاکستان میں ہندو خاصی تعداد میں تھے اور اگرچہ گنتی کے اعتبار سے اقلیت میں تھے لیکن تعلیمی اور اقتصادی شعبوں میں وہ مسلمانوں پر غالب تھے، ان کے ایک قوم

تسلیم کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان علاقوں پر عملاً چھا گئے۔

ازاں بعد اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں تسلیم کر لی گئیں اور یوں بنگالیوں کے علیحدہ تشخص کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ہندوؤں کے زیر اثر تعلیم سے وہاں (اور سندھ میں) سیکولر حکومت کا تصور پھیلتا چلا گیا۔ اور جب "اسلام" بنائے مملکت نہ رہا تو نسل اور زبان کے اشتراک کی بنا پر، بنگالیوں میں جداگانہ قومیت کا رجحان تیز تر ہوتا گیا۔ پچیس سال سے یہ تخریبی عوامل پرورش پاتے رہے اور ارباب اقتدار میں سے کسی نے کبھی نہ تو ان کے سدِّباب کی کوئی فکر کی، اور نہ ہی مثبت طور پر، اسلام کی بنیاد پر واحد قومیت کی تعمیر کے لئے کوئی عملی اقدام کیا، اگرچہ زبانی ہر ایک یہی کہتا رہا کہ اسلام ہی وہ رشتہ ہے جس کی وجہ سے ہم، اور ہزار میل دور، بنگالی مسلمان، ایک قوم کے افراد ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبانی دعاوی اور اعلانات خود فریبی تھا یا خدا فریبی، لیکن تھے بہرحال غیر مؤثر۔ یہ تھے وہ عوامل جو آہستہ آہستہ نشوونما پانے کے بعد مشرقی بنگال کی علیحدگی کا موجب بنے ——— یہ اس کے بنیادی اسباب تھے، باقی سب ہنگامی اسباب۔

مشرقی پاکستان کے ہاتھوں سے چھن جانے کے بعد، اب وہی عوامل یہاں بھی تیزی سے بڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور یہ اُسی سازش کی بڑھتی ہوئی شاخ ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی تھی۔ اس کے لئے ہمارے پاس شواہد موجود ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہندو اثر کے ماتحت وہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کیا ہو چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے کے طالب علم۔ عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو اس نے ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا اور جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان بننے کا نتیجہ تھا کہ:۔

مشرقی پاکستان کی بے باکیاں

> ہم نیتا جی، نتیجیتا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ محمد بن قاسم - طارق - موسیٰ اور علی رضا جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ——— اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ:۔

> مشرقی بنگال کی اس روش کے نتیجے میں، مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۲ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:۔

> ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجہ اجامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی ...... اور نظریۂ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوش نمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پرور طبقہ اس شد و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئیں۔

اس کے بعد، اس نے اپنی ۲۷ فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:-

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچئے کہ بلوچ، پٹھان، پنجابیوں کو کون رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

اب سندھ میں

یہ خیالات عام ہوتے تو (جیسا کہ عزیز الرحمٰن نے کہا تھا) اودھر سے سب سے پہلے ان کی نمود سندھ سے ہوئی۔ چنانچہ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ حریّت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ نومبر ۱۹۷۵ء میں، ایک سندھی طالبہ مس نسیم کھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ ڈی جان کے آثار قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ ایم۔ سید کی طرح کے شاعروں، دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔

اور یہی وہ ایاز اور سید ہیں جو اسلام کے خلاف وہ کچھ لکھتے اور کہتے ہیں جو اس کے بدترین غیر مسلم دشمنوں نے بھی نہیں کہا تھا۔ اور اب یہ اس تحریک کے کاروان سالار ہیں جس کا مطمح نگاہ سندھ کی آزادی اور علیحدگی ہے۔

* * *

پرویز صاحب نے اس قسم کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد کہا تھا کہ مملکت پاکستان کے سینے کا یہ زخم رستے رستے ناسور بن رہا ہے اور اگر اس کے مداوا کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ مہلک ثابت ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بلا تاخیر، کرنے کا کام یہ ہے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھی جائے کہ:-

۱۔ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ' اسلام کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہاں ایک سے زیادہ قوموں کا تصور رکھنا، اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد قرار نہیں پا سکیں گے۔

۲۔ قرآن کریم انسانی زندگی کا واحد، مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات ہے۔ یہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود مقرر کرتا ہے اور مملکت کے قوانین کی اساس قرار پاتا ہے (اسے نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے) سپریم کورٹ کو اس کا اختیار دیا جائے کہ آئین کی کوئی شق یا مملکت کا کوئی قانون جو قرآن مجید کے خلاف ہو، اسے کالعدم قرار دیدے۔ افرادِ مملکت کو بھی اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کی طرف رجوع کرنے کا آئینی حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اس نظریہ کے خلاف کسی تصور کی اشاعت مملکت کے خلاف بغاوت قرار دی جائے۔

۳۔ مندرجہ بالا مفاہیم کے مطابق ' دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کو نصابِ تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔ اور ملازمتوں کے لئے مقابلہ کے امتحانات میں ایک لازمی پرچہ ان موضوعات پر مشتمل ہو۔

اس علاج کی طرف کسی نے توجہ نہ دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم آج تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن اب بھی یہ تباہی سے بچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ مندرجہ بالا تدابیر پر فوری عمل کیا جائے۔ یاد رکھیئے! ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

* * *

باسمہٖ تعالیٰ

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اقبالؒ ـــــ اور

دو قومی نظریہ

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ — اور — دو قومی نظریہ

(اپریل ۱۹۷۳ء)

مملکتِ پاکستان کی اساس وبنیاد (۱) نظریۂ پاکستان اور (۲) دو قومی نظریہ پر تھی۔ یہ اس مملکت کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ یہاں اس قسم کے عناصر شروع سے چلے آتے ہیں — اور پنپ رہے ہیں جو اس مملکت کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کو تو یہ کہہ کر ختم کیا جا رہا ہے کہ یہ ہندو کی تنگ نظری تھی جس سے مجبور ہو کر ہندوستان کا مسلمان اُن سے الگ ہوا! اور دو قومی نظریہ کو عملاً ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی اہمیت اتنی ہی رہ گئی ہے کہ اس قسم کے سوال اٹھائے جائیں کہ اس نظریہ کا بانی کون تھا۔ یہ سوال اٹھانے والے دین کی اصل وحقیقت سے ناواقف ہیں۔ اس نظریہ کا خالق کوئی انسان نہیں بلکہ خود خدائے کائنات ہے جو اسے مختلف انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی انسانوں تک پہنچاتا رہا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کے بعد اس وحی کی اہمیت رکھنے والے انسان اسے وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں، انہی خوش بخت انسانوں میں سر سیدؒ، اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے اسمائے گرامی سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان کے بعد اس فریضہ کی ادائیگی کی سعادت طلوعِ اسلام کے حصے میں آئی ہے جو ۱۹۳۸ء سے اسے قوم کے سامنے تکرار واصرار پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ آجکل چونکہ اس سوال کو پھر ابھارا جا رہا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کی اصلی حقیقت کو طلوعِ اسلام کے صفحات پر بار دیگر پیش کر دیا جائے۔ اپریل ۱۹۷۳ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریب پر پرویز صاحب نے اس موضوع کو اپنے خطاب کا عنوان قرار دیا تھا۔ اس خطاب کو ضروری حک و اضافہ کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ ملّت!
سلام و رحمت۔

کاروانِ انسانیت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں سے لاکھوں انسان روزانہ کہیں گم ہو جاتے ہیں اور لاکھوں نئے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ افراد کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہیگا۔ ان گمشدہ انسانوں کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی داستانِ حیات تو ایک طرف، زمانے کی ریگِ رواں پر ان کے نقوشِ قدم تک بھی نہیں ملتے۔ لیکن اسی گمنام ہجوم اور بے نام ونشان انبوہ میں کبھی کبھار ایسے افراد بھی آ جاتے ہیں جو زندہ و پائندہ روشنی کے میناروں کی طرح چمکتے اور کاروانِ انسانیت کے لئے نشاناتِ راہ اور سراغِ منزل بنتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت درحقیقت انہی قندیلوں کی تابندہ شعاعوں سے عبارت ہے۔ اسی قسم کے افراد تعمیرِ انسانیت کے معمار اور تحسینِ کائنات

کے نقش گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ سیرت ساز اقوام و ملل ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

فطرت کے مقاصد کا عیار ان کے ارادے   دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

انہی زندہ جاوید ہستیوں میں اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کا شمار ہوتا ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔ وہ یگانۂ روزگار جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ :-

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات   تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

صدفِ زمانہ ہزاروں سال تغیراتِ حوادث کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے۔ تب جا کر کہیں اس قسم کے گوہرِ یک دانہ کی نمود ہوتی ہے۔

نقیبِ قرآن

عزیزانِ من! مشرق نے علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا۔ (اسی لئے انہیں زیادہ سے زیادہ شاعرِ مشرق کے لقب سے نوازا گیا) مغرب نے انہیں ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانا اور دنیا کے ممتاز ترین مفکرین کی صف میں انہیں جگہ دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعر و فکر کی دنیا میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن میرے نزدیک ان کا صحیح مقام کچھ اور ہے اور وہ مقام ہے پیامبرِ قرآن ہونے کا (پیغمبر نہیں، پیغامبر یا نقیب)۔ میرے دل میں حضرت علامہ کی جو عظمت و عقیدت ہے وہ ان کے اسی مقام کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم ہمارے ہاں صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپٹی زینت دہِ طاقِ نسیاں ہو رہی تھی۔ اقبالؒ نے اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے فضا گونج اٹھی۔

اس نے خوابیدہ ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا اور کہا کہ :-

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس نے کہا کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ :-

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد   در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس نے اس انقلاب آفریں ضابطۂ حیات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ :-

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

یعنی :-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے   نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف   منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

ایک طرف قرآن نے ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف اس نے مذہبی پیشوائیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا کہ :-

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے   پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اس نے کہا کہ ان خود ساختہ "نمائندگانِ خداوندی" کی حالت یہ ہے کہ :-

حق را بسجودے ، صنماں را بطوافے

یہ طواف بتوں کا کرتے ہیں اور خدا کو اپنے سجدوں سے دھوکا دیتے ہیں اس لئے ع

بہتر ہے چراغِ حرم و دَیر بجھا دو

قرآن انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے رہنمائی دیتا ہے اس لئے پیغام اقبال رحکے بھی متعدد پہلو ہیں۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں تمام گوشوں کا احاطہ کر سکوں۔ ایک نشست میں ان میں سے کسی ایک گوشے ہی کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ میں نے آج کی تقریب کے لئے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا ہے جس نے پاکستان کی اجتماعی زندگی میں انتہائی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور جس پر میرے نزدیک، اس مملکت کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ یہ موضوع ہے — **دو قومی نظریہ** — بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ یہ مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ لیکن، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سیاست سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبال رحنے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا اور اسی کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ پاکستان کی سالمیت کا دار و مدار اسی نظریہ پر ہے۔ اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے خطاب کا موضوع قرار دیا ہے۔

(٠)

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ کہے کہ ایک فقرہ میں بتایئے کہ اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور دین کی غایت الغایات کیا ہے تو اسے پورے حتم و یقین کے ساتھ متعین طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مقصود اور اس کے عملی نظام (دین) کی غایت یہ ہے کہ نوعِ انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے اُسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ انسانوں نے جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ اس طرح

دین کی غایت

کھینچا ہے کہ — كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ‎(۲/۲۱۳)۔ اس وقت تمام انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تزاحم تھا نہ تصادم۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ ان میں "میری اور تیری" کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس لئے "جس کو جہاں بھوک لگتے وہیں سے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا" (۲/۳۵) اس طرزِ زندگی میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا۔ نہ کپڑے کی فکر وجہِ پریشانی ہوتی تھی نہ مکان کی" (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) ان سے کہا گیا تھا کہ تم اسی طرح ایک برادری بن کر رہنا۔ فَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ‎(۲/۳۵)۔ باہمی مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں شجر کی طرح ہو جانا۔ کہ جس کی اصل ایک ہونے کے باوجود شاخیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ لیکن انسانوں نے اس سے اعراض برتا۔ فَاخْتَلَفُوْا ‎(۱۰/۱۹) اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ ابتدائی اختلاف کیا تھا؟ یہ کہ وہ نسل کی بنیاد پر قبیلوں میں بٹ گئے اور جَعَلْنٰكُمْ لِبَعْضٍ

عَدُوٌّ (۲/۳۶)۔ اس طرح ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں جسے قرآن نے فساد کہہ کر پکارا ہے، اور باہمی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا (۲/۲۰۵)، (۳۰/۴۱)۔ ان اختلافات کا مٹانا اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کے بنیادی سبب کا ختم کرنا انسانوں کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انسان اپنے معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرے۔ اسی لئے کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ اس مقصد کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا جو لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں قوموں اور فرقوں میں بٹے رہے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اقدارِ خداوندی کے مطابق امتِ واحدہ بن گئے تو اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہو گا۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (۲/۲۱۳)۔ اس مقصد کے لئے ان انبیاء میں سے ہر ایک کو الکتاب (ضابطۂ ہدایات و قوانین) بھی دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔

یہ تھا عزیزانِ من! انبیاء کے بھیجنے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یعنی ان اختلافات کو مٹا کر جن کی وجہ سے نوعِ انسان، مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی تھی اور اس لئے باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا حشر بپا ہو رہا تھا اسے امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) بنا دیا جائے۔ جو لوگ انبیاء کرامؑ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے نسلی، قبائلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر وحی کی رہنمائی کے مطابق امتِ واحدہ کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے۔ جو اس دعوت کی مخالفت کر کے اپنے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف قبائل اور اقوام کی گروہ بندیوں کو قائم رکھنا چاہتے، وہ ان کے برعکس دوسرا گروہ بن جاتے۔ اول الذکر کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا۔ یعنی امتِ واحدہ کے نظریہ کو تسلیم کرنے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے والے۔ اور دوسری جماعت کو کفار کہا جاتا۔ یعنی اس نظریۂ زندگی سے انکار کر کے نسلی اور قومی امتیازات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنے والے۔ اس طرح پوری نوعِ انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے دوران وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے حصولِ مملکتِ پاکستان کے لئے سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا۔ یہ اسلام کی غایت اور دین کا اساسی اصول تھا جو اس دن وجود میں آ گیا تھا جب خدا کی طرف سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا تھا۔ قرآنِ کریم میں اس سلسلہ زریں کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی قوم کے کچھ افراد اس پر لبیک کہہ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور باقی قوم نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ اس طرح ایک قوم کے بجائے دو قومیں وجود میں آ گئیں۔ ان دونوں قوموں کی نسل ایک تھی، زبان ایک تھی، قبیلہ ایک تھا، وطن ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم نہیں رہی تھی دو قومیں بن گئی تھی۔ ان کے دو قومیں بن جانے کی بنیاد کیا تھی؟ نظریہ کا اختلاف۔ اسے کہا جاتا ہے دین یا ایمان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ ان دو گروہوں میں یہ خلیج اتنی گہری اور ناقابلِ عبور تھی کہ جب حضرت نوحؑ نے نسلی رشتہ کی بنیاد پر کہا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے تو خدا نے یہ کہہ کر ان کا مغالطہ دور کر دیا کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (۱۱/۴۶) وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ اس نظریہ پر ایمان نہیں لایا جسے تم نے پیش کیا ہے۔ یعنی نظریہ کے اختلاف سے وطنی اور قبائلی تعلق تو ایک طرف، خون کا رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کے بعد مختلف اقوام اور ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور وضاحت سے

بتایا ہے کہ انہوں نے اس دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا اور اس کے نتیجہ میں کس طرح ایک ہی وطن میں، نسل، قبیلہ، زبان، رنگ اور خون کے اشتراک کے باوجود نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر دو قومیں وجود میں آتی رہیں۔ ان کا پیش کردہ معیار جس سے اپنے اور بیگانے کی تخصیص ہوتی تھی یہ تھا کہ :۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۔ (۱۴/۳۶)

جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے (جو اس کے خلاف چلتا ہے میرا اس سے
کوئی واسطہ نہیں۔)

یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اسی طرح جاری رہا تا آنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے، سرزمین عرب میں اس نبی آخر الزمانؐ کا ظہور ہوا جس پر دین کی تکمیل ہو گئی اور سلسلۂ نبوت کا اختتام۔ خدا کے اس آخری رسولؐ نے دو قومی نظریہ پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام والتباس۔

حضورِ خاتم النبیینؐ کے دور میں

اس نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے، ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں۔ اور دوسری شق یہ تھی کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہو گی اس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ وہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہوں گے۔ شق اول کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دوسرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاصؓ بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کئے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آئے۔ جہاں تک دوسری شق کا تعلق تھا، حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ اور عرب کا ابوبکر (رضی اللہ عنہم اجمعین)، وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پا گئے اور ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہو گئی کہ اس کے بعد وطن، زبان، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ خدا کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور اس وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ :۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

"مسلمانو! دیکھنا۔ کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ تو اس تفرقہ سے مراد صرف مذہبی فرقہ پرستی نہیں۔ اس سے مراد ہے ہر قسم کی تفریق خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔ وہ ذاتوں اور برادریوں کے رنگ میں ہو اور خواہ جارِ قومیتوں کے پیکر میں۔ یہ تمام اختلافات شرک ہیں اور چونکہ امت کی تشکیل رسولؐ کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ — اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۚ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کی بجائے

مختلف گروہوں میں بٹ جائیں تو اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس باب میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگ میں دو (مسلمان) سپاہیوں میں کسی بات پہ باہمی جھگڑا ہوگیا تو ان میں سے ایک نے سابقہ عادت کی بنا پر، غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلے کو۔ حضورؐ کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچی تو آپؐ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لے آئے اور سخت برافروختگی کے عالم میں فرمایا۔ "تم لوگ ایمان لانے کے بعد پھر عہدِ جاہلیہ کی طرف پلٹ رہے ہو۔ یاد رکھو! یہ اسلام نہیں"! اسلام تو وہ تھا جس کا اعلان حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں جو عالمگیر انسانیت کا منشورِ عظمیٰ ہے" ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:-

> عہدِ جاہلیہ کے تمام باطل نظریات میرے پاؤں تلے ہیں۔ یاد رکھو! تم سب ایک امت ہو۔ تمہارا رب ایک ہے۔ اصل کے اعتبار سے تم سب ایک ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر، نہ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت نہیں۔ بجز تقوٰی کے"۔

حضورؐ کے بعد

یوں دین کی تکمیل ہوگئی۔ حضورؐ کے بعد کچھ عرصہ تک امت، امتِ واحدہ ... رہی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا پڑی اور سب سے پہلے اسی قبائلی تفرقے نے سر نکالا جسے حضورؐ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پہلے، مملکت خلافتِ راشدہ تھی۔ اس کے بعد یہ بنو امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی قرار پاگئی جب سلطنت اور حکومت کی نسبت قبائل کی طرف ہوئی تو مسلمان بھی امتِ واحدہ نہ رہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جس طرح فرقوں میں بٹی، اس سے قطع نظر، یہ قومی اعتبار سے ترکوں، مغلوں، عربوں، افغانوں، ایرانیوں میں بٹ گئی۔ پھر ان میں ذاتوں اور برادریوں کی تفریق در آئی — اب مسلمان، اسلام کی طرف نسبت سے امتِ مسلمہ بننے کے بجائے، سید، پٹھان، قریشی، راجپوت، جاٹ، اعوان، ارائیں کی نسبتوں سے الگ الگ برادریوں میں تقسیم ہوگئے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

نیشنلزم کی لعنت

اس طرح صدرِ اول کے بعد، یہ امت، امتِ واحدہ نہ رہی، مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ گئی۔ یہ چیز یقیناً موجبِ صد انتشار و تشتت تھی۔ لیکن، اس کے باوجود، ایک بات باعثِ اطمینان بھی تھی اور وہ یہ کہ اس دوران میں دو قومی نظریہ کی دوسری شق، بہرحال قائم رہی۔ یعنی مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم کبھی نہ بنے۔ یہ کسر مغرب کے نظریۂ قومیت نے پوری کر دی۔ اس نظریہ کی رُو سے، ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد، بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد قرار پاجاتے ہیں۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زمانے تک، اس نظریہ نے ہندوستان نے بار نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک مسلمان، غیر مسلموں سے الگ، ایک متعین اور منفرد قوم کے افراد تھے۔ انگریزوں نے اس نظریہ کو یہاں بھی عام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔ یہیں سے ہمارے سامنے وہ اقبالؒ آتا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔

اقبالؒ کی پیدائش، تعلیم و تربیت اسی (غیر منقسم) ہندوستان میں ہوئی تھی جہاں کی فضا نیشنلزم کے پراپیگنڈے سے

اقبال کا ذہنی انقلاب

معمور تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہونہار طالب علم کا اس فضا سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔ وہ انہی خیالات کو اپنے ذہن میں لئے مزید تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظام نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں، ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ:-

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ:-

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ:-

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ:-

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ:-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اقبالؒ کے قلب و دماغ میں اس قسم کا انقلاب کس طرح آیا تھا، اس کی وضاحت انہوں نے ۱۹۳۸ء میں (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم) کے ساتھ نظریۂ وطنیت کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں کی تھی۔ (اس معرکہ کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آتی ہے) انہوں نے کہا تھا کہ وطن سے محبت اور اس کی خیرسگالی کا جذبہ ایک فطری امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن:-

> زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں، بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہئیتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہئیتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے "وطن" کو جب ایک سیاسی تصور کے طور پہ استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ (اور یہ وجہ ہے کہ میں اس نظریۂ قومیت کی مخالفت کرتا ہوں)

یعنی جب اقبالؒ کو اپنے قیامِ یورپ کے دوران نیشنلزم کے فلسفہ کا بنگاہِ تعمق مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا اور اس کے ساتھ ہی اس نے وہاں اس کے عملی نتائج کا مشاہدہ کیا تو اس پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ اس سے بڑھ کر انسانیت کا دشمن

کوئی نظریہ نہیں اور اس کے بعد جب اس نے قرآن کی بارگاہ پر دستک دی تو وہاں سے اسے تشکیلِ قومیت کے صحیح معیار کا جواب ملا۔ اس کی فکر میں جو اس قدر بنیادی تغیر واقعہ ہوا اس کی یہ وجہ تھی۔ علامہ اقبال ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آ گئے۔ اس کے دو ہی سال بعد انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں وہ خطاب پیش کیا جس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ اور جس کا اردو ترجمہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اسی زمانہ میں شائع ہو گیا۔ اپنے اس خطاب میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے کہا :-

> مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن۔ نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب (صلے اللہ علیہ وسلم) نے قائم فرمائی تھی' اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے' اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تہذیبی تصور ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت (امت) ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعًا موجود ہے ..... اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے ..... لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسّی اصول' مثلاً وطن پرستی پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں' اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم خود پرورش کر رہا ہے ..... میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے مادی شے کا تالیہ ہے جو سراسر اصولِ اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرکِ خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا۔

آگے چل کر انہوں نے کہا :-

> اسلام ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر۔ اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے' وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول' یا — ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں — "خدا کی رسی" ہمارے

---

[1] یعنی صدرِ اول کی امتِ واحدہ جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن کے سب اختلافات صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں گم ہو گئے تھے۔ (طلوع اسلام)

ہاتھ سے چھوٹی، ہمارا جماعت کا شیرازہ بکھرا

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ علامہ اقبالؒ نے یہ خطاب سنہ ۱۹۱۰ء میں ارشاد فرمایا تھا جب انہیں یورپ سے لوٹے صرف دو برس ہوئے تھے، اور جب ان کی عمر بمشکل (۳۳، ۳۴، ۳۲) سال کی تھی۔

اقبالؒ کا جہاد

چونکہ وطنیت یا قومیت کا یہ نظریہ، اسلام کے نظریۂ قومیت کے خلاف تھا، اس لئے اقبالؒ نے اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا کہ اس کے خلاف شدومد سے جہاد کیا جائے۔ بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم زیبِ دہ اوراق ہے، اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ یہ نظریہ کس طرح اسلام کی نقیض اور نوعِ انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اس نظم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے تماماً آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِؐ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؒ مسلسل اپنی اس پکار کو دہراتا رہا، اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کو (بالخصوص) اس نظریۂ قومیت کی تباہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ کبھی وہ ان سے رمز و ایما کے انداز سے کہتا کہ

با وطن وابستہ تقدیرِ اُمم بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

لیکن —

ملتِ ما را اساس دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

اور کبھی اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا کہ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

* * *

اقبالؒ کا یہ پیغام ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، اسلام کا اصولِ قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں بستے ہوں، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں، محض ایک قوم کے افراد ہی نہیں، ایک دوسرے کے بھائی — اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹/۱۰) قرآن کا ارشاد ہے۔ اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳) خدا نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور یہ اس کا خاص انعام تھا۔ اس اخوت کی بنا پر یہ امت کسی ایک خطۂ زمین میں محدود و محصور نہیں تھی۔ مسلمان جہاں بھی تھا، دنیا کے کسی خطے میں سکونت پذیر تھا، دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور امتِ مسلمہ کا فرد تھا۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزا تھے۔ بنا بریں، جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانوں کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے، اسی طرح جغرافیائی حدود (یعنی وطن کی نسبت) کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے۔ اقبالؒ نے جو اسلام کی اس عالمگیر دعوت کا گہرا احساس رکھتا تھا، اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر پورے کے پورے عالمِ اسلام تک پھیلا دیا۔ اس نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ

عالمگیر امت

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے   نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا   ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی   اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء) میں، انہوں نے اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو   اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی   تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس سلسلہ میں، میں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک عظیم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ ہم میں سے کون ہے جسے اس کا علم و احساس، بلکہ شکایت نہیں کہ دوسرے ملکوں کی مسلمان سلطنتوں نے، ہم ہند و پاک کے مسلمانوں کے مصائب و آلام میں بالعموم اس ہمدردی اور یگانگت کا ثبوت کبھی نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری

ہمارا احساسِ اخوت

کیفیت یہ ہے کہ اگر افریقہ میں کسی حبشی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتے تو ہماری آنکھ کے آبگینے سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اس حکیم الامت نے، اسلام کی عالمگیر اخوت کا وہ پیغام دیا ہے جو نسل، رنگ، وطن کی حدود و ثغور سے ماورا ہے اور جو ہماری ملت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس لئے مسلمانانِ عالم پر کہیں مصیبت آئے، غیر شعوری طور پر ہمارے قلوب وقفِ اضطراب اور ہماری آنکھیں خونناب فشاں ہو جاتی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگِ طرابلس میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنتِ عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تو اس کی یاد میں اقبالؒ نے جو نظم خونچکاں لکھی، اس کے سننے سے آج بھی حساس قلوب سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

اس کے بعد اقبالؒ نے یہ نہیں کہا کہ ایسی بچی، عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کہا یہ کہ فاطمہ خود ہماری بچی تھی۔ وہ صدفِ امتِ مسلمہ کا گوہرِ تابدار تھی۔ اس لئے اس کا یہ کارنامہ ساری امت کے لئے باعثِ صد شرف و عزت ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

اور شاہی مسجد (لاہور) کے صحن میں، وہ قیامت بھی تو جنگِ طرابلس ہی کے شہیدوں کی یاد میں برپا ہوئی تھی جس کے تصور سے آج بھی جگر کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شہدائے طرابلس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے شاہی مسجد میں ایک اجتماعِ عظیم منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ وہ ان شہداء کے غم سے نڈھال تھے۔ افتاں و خیزاں اسٹیج پر آئے اور اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں حضورِ رسالتمآب میں اپنی حاضری کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ جب میں خدمتِ بابرکت میں پہنچا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

تو میں نے (اقبالؒ نے) بصد احترام عرض کیا کہ

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

لہٰذا، ان حالات میں، میں ایسا تحفہ کہاں سے لاتا جو حضورؐ کے شایانِ شان ہوتا۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس پر مجمع کا کیا حال ہوا ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور سنہ ۱۹۲۲ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کو شکست دی ہے تو اسلامیہ کالج (لاہور) کے میدان میں اقبالؒ نے جس درد و کرب سے اپنی نظم — خضرِ راہ — پڑھی تھی اس کی یاد آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

اور انتہائی مایوسی کی اس تاریک فضا میں، اس "امیدوں کے شاہزادے" نے آخر میں یہ پیغام دیا کہ:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا يُخْلِفُ الْمِيعَاد دار

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پیغامِ حیات بخش دیتے وقت، اس دیدہ ور کی نگہِ دور رس نے اُس انقلاب کو بے نقاب دیکھ لیا تھا جو اُس وقت ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا اور جس کی رُو سے، دوسرے ہی سال، ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر اپنے لئے حیاتِ نو کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ترکوں کی اس محیر العقول کامیابی پر اقبالؒ طرب و نشاط کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لے کر رقصاں و فرحاں، جس طرح اسٹیج پہ آیا اور جوشِ مسرت میں جس ولولہ اور طنطنہ سے اپنی نظم "طلوعِ اسلام" پڑھی اس کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ آتے ہی کہا کہ

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور ـــ

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۵)

یورپ کی مخالفت

جب تک اقبالؒ نے اسلام کے معیارِ قومیت کے پیغام کو ہندی مسلمانوں تک محدود رکھا، اس کے خلاف کوئی ایسا ردِ عمل نہ ہوا۔ اسے محض ایک شاعر کا خواب کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اُس زمانے میں یہاں کی سیاسی فضا پر اس کا کچھ اثر نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے اس پیغام کو دیگر مسلم ممالک تک پہنچایا تو مغربی سیاست کے مہرہ بازوں کے دل میں اس سے طرح طرح کے خطرات نمودار ہوتے۔ ان خطرات کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی تھی۔

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ (بیان، مولانا حسین احمدؒ کے جواب میں)

یہ تھی مغربی اقوام کی وہ سازش جس کے لئے، مہرہ بازانِ افرنگ، پیغامِ اقبالؒ میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ انکے مفکرین نے گو مشفقانہ ہمدردی کے لباس میں، اُسے یہ طعن دیا کہ وہ اپنے عالمگیر انسانیت کے پیغام سے ہٹ کر، اس قسم کی "فرقہ وارانہ" تنگنائے کی طرف کیسے چلا گیا؟ پروفیسر نکلسن کے نام علامہ اقبالؒ کا خط اس سازش کی غمازی کرتا ہے جس کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں

> ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان، عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔
>
> یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے محض اس کی محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جاتا۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کیلئے موزوں واقع ہوئی ہے..... فوز و فلاحِ انسانیت کے پروگرام کو عمل میں لانے کیلئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کر دیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عمل کو لئے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ (جنوری ۱۹۲۱ء)

ہندوستان میں سیاسی تغیرات

جس مقصد کے پیشِ نظر، علامہ اقبالؒ نے اپنے عالمگیر پیغام کو ابتداءً مسلمانوں تک محدود رکھنا ضروری سمجھا، اسی قسم کے تقاضا نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ وہ اس دائرے کو پہلے مسلمانانِ ہند تک محدود کر دیں۔ اس کی وجہ اس زمانے میں ہندوستان میں سیاسی تغیرات کی نمود تھی۔ انگریز کے اپنے حالات اسے مجبور کر رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اہلِ ہند کی طرف منتقل کرے۔ ہندو نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وطنیت کی بنا پر نظریۂ قومیت کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ۔

۱۔ ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگ، بلالحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔
۲۔ حکومت کے اختیارات اس قوم کی طرف منتقل ہوں گے۔
۳۔ یہاں جمہوری نظام رائج کیا جائے گا جس میں مملکت سے متعلق تمام فیصلے اکثریت کی آرا سے ہوتے ہیں۔
۴۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی ہے اور ہندو ہی کی رہنی تھی۔
۵۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہمیشہ کیلئے ہندو اکثریت کے محکوم رہیں۔

یہ تھا یہاں کے بدلتے ہوئے حالات کا فوری تقاضا جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کو اپنی تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند پر مرکوز کر دینی پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد سے اس حقیقت کو عام کرنا شروع کر دیا کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور مستقل بالذات قوم ہیں اور یہاں کے غیر مسلم ان سے الگ، دوسری قوم کے افراد۔

آپ نے دیکھا، برادرانِ عزیز! کہ دو قومی نظریہ، نہ تو کسی ہنگامی سیاسی تقاضا کی پیداوار تھا اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے لئے حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ اُس دن وجود میں آیا تھا جس دن خدا کی پہلی وحی عالمِ انسانیت کی طرف بھیجی گئی تھی۔ یہ دینِ خداوندی کا اساسی اصول ہے اور توحید اور شرک میں خطِ امتیاز۔ اشتراکِ دین کے سوا کوئی بھی معیارِ قومیت ہو، وہ اسلام کے خلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اقبالؒ نے اس نظریۂ قومیت کی نشر و اشاعت یورپ سے واپسی کے بعد شروع کر دی تھی۔ وہ ساری عمر اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ ان کے اس پیغام کے مخاطب کسی خاص خطہ کے مسلمان نہیں تھے، ساری دنیا کے مسلمان تھے۔ لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا کہ ہندوستان میں سیاسی تغیرات اس تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ عام نہ کیا گیا تو نیشنلزم کی رو سے یہاں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا تو انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنے پیغام کا اولین مخاطب قرار دے دیا، یہ کہتے ہوئے کہ اگر ہم یہاں اس نظریہ کو عمل میں لانے کے قابل ہو گئے تو یہ چیز باقی ممالکِ اسلامیہ کے لئے نظیر بن جائے گی اور اس طرح یہاں کی مسلم قوم، عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل کے لئے ذرۂ اولین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے گی۔

ہندو کی طرف سے مخالفت

جب ہندو نے دیکھا کہ اقبالؒ کا یہ پیغام کس طرح ان کے اس خواب کو جس کی رُو سے وہ مسلمانانِ ہند کو ابدی طور پر اپنا محکوم رکھنا چاہتا تھا، خوابِ پریشاں بنا دے گا تو اس نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اقوامِ مغرب، مسلمانانِ عالم کے امتِ واحدہ بن جانے میں اپنے استعمار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھیں، اس لئے انہوں نے اسے مذہبی جنون (FANATICISM) کہہ کر اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ ہندو نے مسلمانانِ ہند کے ایک الگ اور منفرد قوم کی حیثیت اختیار کر لینے میں اپنے سیاسی تغلب کے منصوبے بگڑتے دیکھے، اس لئے اس نے بھی اس کی مخالفت کی۔ یہ ہے ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی کشمکش کی تمہید۔ یاد رہے کہ دو قومی نظریہ کی مخالفت، ہندو کے نزدیک تو یکسر سیاسی نوعیت کی تھی، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس نظریہ پر اصرار ان کے دین کا تقاضا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دینی تقاضا کے پورا ہونے سے انہیں سیاسی مفاد بھی حاصل ہو جاتے تھے —— حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ملت کے سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوتی۔

آئیے! اب ہم دیکھیں کہ ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی جنگ کیسے لڑی گئی۔

(۰)

نیشنلسٹ مسلمان

یہ حقیقت بڑی جگر پاش اور اس کا تذکرہ بڑا دلخراش ہے کہ مخالفین نے جب کبھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا تہیہ کیا تو اس مقصد کے لئے انہیں خود مسلمانوں میں سے آلۂ کار مل گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے تھا اور ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ پر تھی۔ لیکن اسے خود ہندی مسلمانوں میں سے ایسے لوگ مل گئے جو اس نظریہ کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان میں بعض لوگ محض سیاسی حیثیت کے حامل تھے۔ ان کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی اگرچہ یہ امر موجبِ تاسف تھا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ المناک اور زہرہ گداز یہ سانحہ تھا کہ ان مخالفین کی قیادت مذہبی پیشواؤں یعنی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو مطمئن تھا کہ مسلمان اپنے جس دعویٰ کو مذہب کی بنیادوں پر پیش

معرکۂ دین و وطن

کر رہے ہیں اس کی مخالفت خود انہی کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اپنے انتہائی نقطہ پر اس وقت پہنچی جب شروع ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں۔" ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم، دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس نعرۂ جاہلیہ کو سنا تو اُن کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آں سوتے افلاک تک جا پہنچی کہ:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربیؐ است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "بمصطفےٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دینؔ خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اُس رسولؐ کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے، اسلام کے پیرو، امتِ محمدیہؐ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسول سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، اس حقیقت پر قرآن کی وہ آیۂ جلیلہ شاہد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (۱۵۹/۶)۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ گروہ، پارٹیاں، قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسول سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسولؐ اللہ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے حضورؐ نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی — اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو — تمام بولہبی است — پھر دین باقی نہیں رہتا، بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ مرورِ زمانہ سے یہ دستاویز (بالعموم) نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے، اور پاکستان میں وطنیت کی تحریک پھر سے باندازِ نو ابھاری جا رہی ہے۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے اہم حصے سامعین کے گوش گزار کر دیئے جائیں۔ ان حقائق کی اہمیت کے پیشِ نظر ان اقتباسات کی طوالت کے لئے مجھے معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے سب سے پہلے

یہ کہا کہ :-

> مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا :-

> کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھےلہ جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی — یعنی موحد اور مشرک۔ اس وقت سے صرف دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں، تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی۔ وَ إِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ إِسْمَاعِيلُ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ (۲/۱۲۷-۱۲۸)۔ کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی حصہ کسی عربی۔ ایرانی۔ افغانی۔ انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملۃ واحدۃ کی ہے۔

اس اصولی حقیقت کی وضاحت کے بعد کہا۔

> اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت' ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت ملی قائم رکھی۔ . . . . محمد (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ انکی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را   نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ   نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

> حضور رسالتمآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے

لہ سب سے پہلے پیغمبر صرف اس اعتبار سے کہ آپ نے تعمیر کعبہ' امتِ مسلمہ کے لئے ایک محسوس مرکز کی بنا رکھی۔ ورنہ دو قوموں کی بنیاد تو خدا کی طرف سے اولین وحی نے رکھ دی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

> درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوستی کی راہ ہوتی، نبی آخرالزماں کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اجاگر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اُس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسٰیؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسٰیؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے یعنی نبوت کو حضرت عیسٰیؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ امتِ حضرت عیسٰیؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسٰیؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور ذاتِ رسالتمآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید امت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے اس بیان میں متنبہ کیا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگی۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔

علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک مسئلہ قومیت کی، اسلامی نگاہ سے وضاحت کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھار گئے اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ ہاتھ تھے، اللہ کے بندے

محمد علیؒ جناح کے، جنہیں ملّتِ اسلامیہ نے قائدِ اعظمؒ کے برجستہ، موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا — رحمہما اللہ تعالیٰ۔

جناح کی زندگی کا عظیم انقلاب

میں نے شروع میں کہا ہے کہ اقبالؒ ہندوستان سے گیا تو "میرا وطن، میرا وطن" کہتے ہوئے اور انگلستان سے واپس آیا تو اس نظریۂ وطنیت کو انسانیت اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ابلیس کی اختراع قرار دیتے ہوئے۔ اقبالؒ کی زندگی میں یہ انقلاب بڑا تحیّر انگیز ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے وہ انقلاب جو محمد علی جناحؒ کی زندگی میں رونما ہوا۔ وہ نہ صرف یہ کہ عقیدۂ وطنیت پر نظری طور پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بلکہ عملاً بھی ان کا شمار کانگریس کے بلند ترین رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ "بمبئی کا جناح کانگریس ہال" آج بھی ان کے عقیدۂ وطنیت کی یاد تازہ کراتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبالؒ کی نگہِ دوربین نے کیسے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے لئے دو قومی نظریہ کی بنا پر ایک جداگانہ[1] مملکت کا حصول اس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوگا جو اس قدر کٹر وطن پرست اور صفِ اول کا کانگریسی تھا۔ اسے کہتے ہیں دیدہ وری اور مومنانہ فراست! قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات کا مرتب ہکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ "اپنے قیامِ انگلستان کے دوران، مسٹر جناح نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے لیکن اس کے باوجود، جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا" (ص ۹۵)۔ معلوم نہیں اقبالؒ نے جناح کو کس کس طریق سے (CONVERT) کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی کوششیں جلد نتیجہ خیز نہ ہوئیں، لیکن انہوں نے دامنِ امید کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جناحؒ کی ذات پر کس قدر بھروسہ، اور اپنی مساعی کے بارآور ہونے پر کس قدر یقین محکم تھا۔ برسوں کی کوششوں کے بعد انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناحؒ کو وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ، میری نگاہوں میں اس وقت، ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ، اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

یہ تیر، اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اور پھر اقبالؒ اپنے پیغام کی شمع جناحؒ کے ہاتھوں میں دیکر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے:

میرے نزدیک انٹیلکٹ جناحؒ میں یہ نظری تغیر پیدا کرنا، اقبالؒ کا اتنا بڑا احسان ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ قائدِ اعظمؒ اس نظریہ کی لِم، قرآنی نقطۂ نگاہ سے اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

---

[1] اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی الگ مملکت کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اسے قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی شکل میں متعین کر دیا۔

قائد اعظمؒ نے اس جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوا لیا کہ مسلمان 'دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں' اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔ چونکہ آج کی نشست میں میرا موضوع علامہ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ ہے۔ اس لئے میں اس وقت اس جنگ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو قائد اعظمؒ نے دس سال تک لڑی۔ اس کی تفصیل میں گذشتہ پچیس سال سے بیان کرتا چلا آ رہا ہوں اور آئندہ بھی بتوفیق ایزدی مناسب مواقع پر بیان کرتا رہوں گا کہ یہ جنگ درحقیقت دین و وطن کی آویزش اور کفر و اسلام کا معرکہ تھا جسے بیان کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔

قائد اعظمؒ نے دس سال تک یہ جنگ لڑی اور بالآخر پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں سے پھر ایک ایسی داستان کا آغاز ہوتا ہے جو سابقہ داستان سے بھی زیادہ حیرت افروز، عبرت انگیز اور اس کے ساتھ ہی جگر سوز اور دل دوز ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دو قومی نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اور دوسری شق یہ کہ تمام مسلمان 'دین کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ (ایک قوم) ہیں۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلافات یہ مختلف قومیتوں یا گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائد اعظمؒ کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہو گئی اور اس کے بعد جب مملکت پاکستان کے لئے آئین مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ اس میں پہلی شق کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندوں — مسلمانوں اور غیر مسلموں — کو ایک قوم قرار دے دیا گیا ہے۔

حصولِ پاکستان کے بعد

یہ چیز نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف تھی بلکہ اس دعویٰ کے بھی خلاف جس کی بنا پر ہم نے ایک الگ مملکت حاصل کی تھی۔ اس سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے دیا۔ اور اس طرح پاکستان کی وجہِ جواز کی خود ہی نفی کر دی۔ یہاں پچیس سال سے آئین سازی کی مہم جاری ہے۔ مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے لیکن یہ مطالبہ کرنے والوں میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنیاد پر تشکیلِ قومیت' اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ 'وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) موقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکستِ پندار ہوئی تھی، اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں غیر مسلموں (ہندوؤں) کی آبادی کثیر تھی، اور دوسرے اس لئے کہ وہاں غیر مسلم بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں کی اقتصادیات اور سیاست ان کے ہاتھ میں تھی، مسلمان بچوں کی تعلیم کے نگران بھی وہی تھے۔ تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آگیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جد و جہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا بلکہ اپنی نشاد لوگی تعلیم ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیدی جو اس نظریہ کے مخالف تھے! اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل وہ ذہنیت لے کر ابھری جس کی ترجمانی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن نے اپنے اس خط میں کی تھی جو ۱۹۶۹ء میں وہاں کے اخبارات میں شائع ہوا تھا[1]۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا رہا کہ مسلمان'

---

[1] اس قسم کی دستاویزات طلوعِ اسلام کی مختلف اشاعتوں میں اکثر و بیشتر شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ مناسب مقام پر انہیں دہرا دیا جائے۔ (طلوعِ اسلام)

مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

> ہم شری چیتینا، خودی رام، سبھاش بوس، سجاتے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسےٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا — یعنی اللہ — کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس حصۂ پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ کوئی اس کی وجہ اقتصادی استحصال قرار دیتا ہے کوئی سیاسی غلطیاں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس حقیقت کی طرف نہیں اٹھتی کہ اس کا بنیادی سبب' ہمارا یہ غلط اقدام اور غلط تعلیم ہے جس کی رو سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا ہے جب آپ وطن کو معیارِ قومیت قرار دے لیں گے تو جس علاقے کے لوگ چاہیں گے اپنے علاقہ کو اپنا وطن قرار دے کر اپنے آپ کو جداگانہ قوم قرار دے لیں گے' اور جب وہ ایک الگ قوم بن جائیں گے تو اس کے بعد ان کی جداگانہ مملکت کا دعویٰ اور مطالبہ جائز قرار پا جائے گا۔ ہم مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو رو رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغربی پاکستان بھی اسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر مشرقی پاکستان چل رہا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۹ء میں "کراچی کی عوامی ادبی انجمن" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم"، جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

مغربی پاکستان میں وطنیت کا تصوّر

> ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے' وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں' ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ پہلی چنگاری تھی جو مغربی پاکستان کے نیستانِ ملّت میں پھینکی گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اب اس حصۂ پاکستان کا بھی کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ چونکہ جداگانہ قوموں کے لفظ سے یہاں کے عوام بدکتے تھے اس لئے محض بغرضِ تلبیس "قوموں" کی جگہ "قومیتوں" کی اصطلاح وضع اور اختیار کر لی گئی ہے۔ یہ محض لفظی فریب ہے ورنہ قومیت سے درحقیقت ان کی مراد قوم ہی ہے۔ مغربی پاکستان میں' وطن سے مراد صوبہ لیا جا رہا ہے۔ اور چونکہ یہاں چار صوبے ہیں اس لئے چار قومیتوں کا تصور عام کیا جا رہا ہے۔ قوم ہو یا قومیتیں اور پانچ ہوں یا چار' مقصد اسلامی معیارِ قومیت کے بجائے وطنی معیارِ قومیت کے نظریہ کا عام کرنا اور اس طرح مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بالآخر اس کے جداگانہ وجود کو ختم کرنا ہے۔

عام پراپیگنڈا

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مسز اندرا گاندھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اُس نظریہ پر جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

اُس نے اُدھر یہ کہا اور اِدھر خان عبدالولی خان صاحب نے فرمایا کہ[لہ]

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ (نوائے ۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

بیٹے نے یہ کہا۔ (اور ان کے والد بزرگوار خان عبدالغفار خان) نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہو گی۔

انہوں نے یہ بات آج ہی نہیں کہی۔ وہ پہلے دن سے نیشنلسٹ ہیں اور ہندو سے بھی زیادہ متشدد نیشنلسٹ۔ وہ اپنے اس عقیدہ کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ کابل سے بھارت گئے ہیں تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ:۔

> میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اُس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی۔ لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔
>
> (سٹیٹسمین - ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۹ء - بحوالہ پاکستان ٹائمز ۱۹ ۲۲ء)

چار قومیتوں کا نظریہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں داخل ہے اور اس کے راہنما اٹھتے بیٹھتے اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی (گزشتہ مارچ ۱۹۷۰ء) میں مسٹر غوث بخش بزنجو نے مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس نظریہ کو دہرایا تھا۔ یہ آواز اب نیشنل عوامی پارٹی یا اس کے ہمنواؤں تک محدود نہیں رہی، ہماری نئی نسل کے ہر نوجوان کے لب پر عام ہو رہی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خود (یا ان کے اساتذہ یا معتقداؤں نے) تحریک پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے وہ جب دیکھتے ہیں کہ یہاں نظریۂ وطنیت عام ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ آخرالامر جیت اُنہی کی ہوئی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے اس لئے ان کی قومیتیں مختلف ہیں۔ کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندۂ معنیٰ نہیں ہوا۔ کلچر کے مدعیوں سے پوچھیے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ بات سمٹ سمٹا کر خوراک، لباس، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و ماند یا فنونِ لطیفہ پر آ جائے گی۔ ان "دانشوروں" کو کون بتائے کہ جو اسلام، وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو بھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا کیا وہ وضع قطع، تراش خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیار قومیت تسلیم کر لے گا۔ قرآن کریم، اختلاف رنگ

[لہ] اسے پیش نظر رکھیے کہ یہ خطاب اپریل ۱۹۶۸ء میں پیش کیا گیا تھا۔ (طلوع اسلام)

اور زبان و الوان و السنہ کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انہیں معیارِ قومیت قرار نہیں دیتا۔ اس نے جو امتِ واحدہ تشکیل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ اسلام نے ایمان کو قدرِ مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک امت کے افراد بن گئے۔ حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرزِ بود و ماند (بقول ان حضرات کے ان کا کلچر) الگ الگ تھا۔ اسلام طرزِ بود و ماند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے، نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرزِ بود و ماند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے۔ اگر "کلچر" نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے۔ اس سے مراد اندازِ بود و ماند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی نگاہ مراد ہے جو مستقل اقدار کی صداقت پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کے مظاہر اور ان اقدار کو بروئے کار لانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن اس کا ان کے ملتِ واحدہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

لیکن ہمارے ان دانشوروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کو "پاکستانی کلچر" دکھانے کے لئے موہنجوڈارو لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیمِ ہند کے وقت حدودِ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ اگر تقسیم کی لکیر ذرا اُدھر کھنچ جاتی تو وہ بھارتی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا۔

دو قومی نظریہ کے مدعی

یہ تو ان لوگوں کی کیفیت ہے جو دو قومی نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن جو اس نظریہ کی تائید اور مدافعت کرتے ہیں بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو وہ بھی اس نظریہ کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض اپنے سیاسی حریفوں کی مخالفت کے لئے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت "وطن کا اشتراک نہیں" دین کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وطن میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں پا سکتے۔ چار قومیتوں کے مدعی وطن کو معیارِ قومیت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مختلف صوبے مختلف وطن ہیں۔ اس لئے ہر صوبے کے باشندے، بلا امتیازِ مذہب، الگ قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ کے موجودہ مؤید کہتے ہیں کہ پاکستان (یا اب مغربی پاکستان) ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ فرمائیے کہ اصول کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں فرق کیا ہے۔ وطن کو بطور معیارِ قومیت دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف وطن کی حدود میں ہے۔ ایک گروہ صوبوں کی حدود کو وطن قرار دیتا ہے، دوسرا گروہ پورے مغربی پاکستان کو وطن کہتا ہے۔ اسلام کو معیارِ قومیت نہ یہ تسلیم کرتے ہیں نہ وہ۔ یاد رکھیے کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے خواہ وہ ایک وطن ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں، اس وقت تک دو قومی نظریہ کا دعویٰ حقیقت نہیں بن سکتا۔ دو قومی نظریہ کے حامیوں سے آپ پوچھئے کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں، فرمائیے کہ پاکستان میں، وہ قومیں کون کون سی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ دو قومی نظریہ کی حقیقت کو وہی سمجھ سکے گا جو اسلام کے اصولوں پر غائر نگاہ رکھتا ہو۔ محض سیاسی عینک سے اس نظریہ کو اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

کہا جائے گا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا یہاں کے مسلمانوں کا ہم قوم قرار پا جانا ہماری سیاست کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال سیاست کا نہیں، دین کے اصول کا ہے۔ غیر مسلم خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، اگر اسے اور مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ایمان کے اشتراک کو نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا۔

یہاں کے غیر مسلموں اور مسلموں کو ایک قوم قرار دیدینا، اس متحدہ قومیت کو وجود میں لے آتا ہے جس کی ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران اس شدت سے مخالفت کی اور جو اسلام کے نظریۂ قومیت کی حریف ہے۔ لہٰذا، جب تک یہاں غیر مسلموں کو آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار نہیں دیا جاتا، دو قومی نظریہ کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔

(٠)

آئینِ پاکستان میں خدا خدا کر کے ختمِ نبوت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا۔ اس سے میرزائی حضرات (جو اپنے آپ کو احمدی کہہ کر پکارتے ہیں) دائرۂ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

(۱) جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جا سکتے، نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے، نہ ہمارا آئین اسلامی۔ دو قومی نظریہ کا عملی مفہوم یہی ہے۔

(۲) جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے، نہ ملتِ واحدہ وجود میں آ سکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا۔

(۳) جب تک دو قومی نظریہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا اور

(۴) جب تک آپ قرآنی نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع نہیں قرار دیتے، نہ اقبالؒ کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ قائدِ اعظمؒ کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہو گا۔ اور قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں نہ مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔ اور آپ مجھے، اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں، اس جگر شگاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان اور اس کے عملی تقضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے تو اوّل تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وہ المیہ تھا جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

حق اگر از پیشِ ما بردارش　　پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

و یٰلیتنی مت قبل ھٰذا وکنت نسیًا منسیًا۔

(۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء)

باسمہ تعالیٰ

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

خدائی فیصلے

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

(نوشتہ ـــــ نومبر ۱۹۷۱ء)

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (۲۴/۳۴) ہم نے تمہاری طرف واضح قوانین زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا، یہ نکتہ قابل غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا، وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانین فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہ کائنات سرگرم عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ زوال پذیر ہو کر رفتہ رفتہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ اور اس کے بعد وہ قوم مخاطب اور آنے والی اقوام عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں تم خود فیصلہ کر لو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ و برباد ہونا۔ اگر زندہ و شاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کر لو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہو گی، اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ دیکھئے! وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ

دیدۂ عبرت کشا!

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں، اور انہوں نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمت گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد

ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر۔ اُن کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۸۲/۴۰) لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (۸۳/۴۰) لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلابِ آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے، اس سے ہمارے ہاں ہُن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جا ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو اُن سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ انہیں اُن تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (۸۴/۴۰) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے، اُسے مسترد کرتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ لیکن جب تباہی سامنے آکھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ پھر اس قوم کی ہلاکت اٹل ہوتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ۔ (۸۵/۴۰) یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۶۲/۳۳) اور تو خدا کی اس روش، اس قانونِ محکم میں، کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ

آگے بڑھنے سے پہلے، ضمناً یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے دور میں، ایک اور گوشے سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اس سے ماسبق نظام کا ہوا تھا۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے جسے جدلیت (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے۔ تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس قدر اٹل اور منہ زور واقع ہوئی

ہے تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے اس قدر مہیب اور لافانی قوت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا، نہ دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مارکس نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا لیکن، یہ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں — اس لئے اسے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس کے لئے اُس نے "تاریخی وجوب" کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعوری خلا کو پُر کر لیا۔ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آجائے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے، تاریخ ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس قسم کا معاشی نظام رائج کیا گیا، اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ، بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت میں تاریخ کا ایک اور تصور بھی ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں "تاریخ کی مادی تعبیر" (THE MATERIALIST CONCEPT OF HISTORY) اس تصور کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلز (ENGELS) اس باب میں لکھتا ہے:۔

> "تاریخ کے مادی تصور کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے ..... اس تصور کی رو سے، ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اس کے بنیادی اور اصلی سبب کو، لوگوں کے دلوں کے اندر، یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس دَور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔
>
> (ANTI DUHRING — P. 300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے کہ:۔

> اس میں شبہ نہیں کہ، آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر، شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (FALSE CONSCIOUSNESS) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔
>
> (MARX — ENGELS CORRESPONDENCE. P. 510—511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تصادمات کہتے ہیں، وہ حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں، وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین، حتّٰے کہ حضرات انبیاء کرام (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو اسے حق و باطل کا تصادم

سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہو وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت قانون میں ہوتی ہے، قانون کی سرگذشت میں نہیں۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگذشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لئے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام و عواقب کو سامنے رکھ کر، تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم کی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگذشتیں بیان کرتا، عہدِ نبی اکرمؐ تک پہنچ گیا ہے۔ اس خطاب میں بتایا جائے گا کہ قرآنِ کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

تمہیدی وضاحت

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآنِ کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ ان میں سے صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں جس کے برگ و بار ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول بھی سب سے زیادہ زور اسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا، اور اسی کو ان کی تباہی کا موجب بتاتا ہے۔ ان اقوام کی سرگذشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہو جائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اور یہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں نہ ہوں۔ اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن غلط اجتماعی نظام کے تباہ کن نتائج کو ان کی انفرادی نیکیاں روک نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵) اس فتنے سے بچتے رہو جو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تساہل یا تغافل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے ہاں نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔ غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس کی جگہ صحیح نظام قائم کریں، یا ان لوگوں سے الگ ہو کر، کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔ اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب قریب ہر رسول کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان اہم اقوام کی سرگزشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

* * *

قومِ (حضرت) نوحؑ

قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کے سلسلہ کا آغاز قومِ نوح سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں، اس لئے وہ ان اقوام کے زمان و مکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصدِ پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔ اس معاشرہ کی نمایاں خرابیاں کیا تھیں اور اس کا انجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال و کوائف سے اس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی یا واسے کرنا بھی یہی چاہیئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پارتھین قوم نے یہ کیا اور اس کا انجام یہ ہوا، تو قومِ مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پارتھین قوم کون تھی، کہاں تھی، انکی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں؛ یہ سلسلۂ بحث و تمحیص شروع ہو جاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں، قومِ مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات، ان کے گرد و پیش اور ان کی مسافرت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ (۲۰/۱۲۸) جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگزشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا، اور اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغازِ داستانِ قومِ نوحؑ

کہا یہ جا رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قومِ نوحؑ کی سرگزشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بستی تھی اور ان کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح کا تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم، زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح بت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کہ سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم و رواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملے تھے انہیں بے حد مقدس سمجھتے اور ان پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے خواہ وہ کتنا ہی دلائل و براہین پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کی علمی، ذہنی اور تمدنی سطح تو یہ تھی لیکن معاشرہ میں طبقاتی

طبقاتی امتیازات

امتیازات بڑی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور یہی اس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ - (۱۷/۷۰)، تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار

کی رُو سے ہوگا، نہ کہ حسب نسب، پیشہ یا دولت کے معیار کے مطابق۔ یہ تھی وہ بنیادی قدر جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا۔ اور جس کی مخالفت، اور سخت مخالفت، اکابرینِ قوم کی طرف سے ہوئی۔

مخالفت ملاءِ قوم کی طرف سے

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ہر رسول کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اس کے انقلابی پیغام کی مخالفت، سب سے پہلے ملاءِ قوم نے کی۔ اس میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آتے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قَالَ الْمَلَاُ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "سردارانِ قوم"۔ عربی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے۔ لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے برتن ضروریاتِ زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں۔ یعنی قوم کا دولت مند، خوشحال طبقہ۔ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پہ عیش و آرام کی زندگی بسر کریں جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، قوم کے دولت مند، سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو۔ تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ۔ تو اس قوم کے اکابرین نے جن کے ہاں دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلکِ زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، اس سے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ۔ (۱۱/۲۷) تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے، کمینے اور رذیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نہ انہیں عقل ہے نہ فکر۔ اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوتِ حق و صداقت پر مبنی اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔ (۱۱/۲۷) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کون سی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کا پیشہ کیا ہے۔ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (۲۶/۱۱۲) میری نگاہ ان کی سیرت و کردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیارِ تکریم و تعظیم، کردار کی بلندی اور جوہرِ ذاتی کی گراں مائیگی ہوتا ہے۔ نہ حسب و نسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز۔ حسب و نسب کی تفریق انسانی انانیت کا خود ساختہ امتیاز ہے۔ اور پیشوں کا فرق، معاشرہ میں تقسیمِ کار کا فطری نتیجہ۔ لہٰذا ان امور کو شرفِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش مزدور، کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحبِ ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرینِ قوم نے کہا۔ یٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا۔ (۱۱/۳۲) اے نوح! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقع ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کر لیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث و تمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔

ایک فیصلہ کن بات سن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف و اجلاف، رؤسا و غرباء اور سرمایہ دار اور محنت کش، ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان متکبرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بے ہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رو سے انسانوں کی وجہِ جامعیت واحدہٗ ایمان ہے۔ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۲۶/۱۱۴) میں تمہاری خاطر، ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں، دھتکار نہیں سکتا۔ وَيَا قَوْمِ مَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِن طَرَدتُّهُمْ۔ (۱۱/۳۰) اگر میں انہیں دھتکار دوں، تو تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے، لیکن یہ بتاؤ کہ اس جرمِ عظیم کی پاداش سے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے مجھے ملے گی، مجھے کون بچا سکے گا؟ اگر میں نے ایسا کیا تو إِنِّي إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ۔ (۱۱/۳۱)۔ تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتے تو اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر، طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال عام کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ ..... لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ۔ (۲۶/۱۱۶) اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا مؤثر ترین آلہ کار تھی۔ وجہ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کر دی کہ تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔ (۱۴/۱۰)۔ لوگو! دیکھو! یہ نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء و اجداد پوجتے چلے آئے ہیں۔ امیر اور غریب کا فرق خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے۔ مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ (۲۳/۲۴) ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآن کریم کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادت مند افراد نے حق و صداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقیماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا انہیں تباہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی وقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی انہی موجودہ افراد تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی انداز معاشرت کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح یہ وجہِ تفریقِ انسانیت انداز معاشرہ نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ (۷۱/۲۶) بار الٰہا! ان لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دے۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ (۷۱/۲۷) اگر ان لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی آنے والی نسل بھی، جو انہی کی گود میں

پروان چڑھے گی، انہی نظریات کی حامل ہوگی۔

معیارِ قومیت

یہ تھا وہ جرمِ عظیم جس کی پاداش میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان تباہ ہونے والوں میں خود حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن ایک اور نکتہ کو سامنے لایا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ قوم سرکش تو غرق ہوجائے گی لیکن میں "تیرے اہل" (یعنی تیرے اپنوں کو) بچاؤں گا۔ جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا بھی غرق ہونے والوں کے زمرے میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ بار الٰہا! تونے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لے گا۔ تو بیٹے سے بڑھ کر اہل کون ہوسکتا ہے۔ اسے کیوں نہیں بچایا جاتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ اے نوحؑ! یہ تیری بھول ہے جو تو اس لڑکے کو محض اس بنا پر کہ اس کے ساتھ تیرا خون کا رشتہ ہے، اپنے اہل میں سے سمجھتا ہے۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ یہ یگانہ نہیں، بیگانہ ہے۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) اس کے اعمال و کردار معیارِ خداوندی کے مطابق نہیں۔

یہاں قرآن نے، اپنے اور بیگانے، کا ایسا بنیادی اصول بیان کردیا ہے، جو اسلامی نظریۂ قومیت کی اساس قرار پاگیا یعنی (حضرت) نوحؑ کا بیٹا، خون، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود، اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ اپنوں میں سے وہی سمجھے گئے جو ایمان کے رشتے میں مشترک تھے۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی بھی چونکہ ایمان میں شریک نہ تھی اس لئے وہ بھی غیر قرار دے دی گئی۔

قرآنِ کریم نے اپنے بلند، عالمگیر، غیر متبدل اصولوں کی صداقت کے لئے جس قوم کی سرگزشت سے آغازِ داستان کیا، اس میں بتایا یہ گیا ہے:

(۱) جس قوم میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہوچکی ہوں، جہاں اشراف اور رذائل کی تفریق پیدائش کی رُو سے کی جائے، جس میں عزت کا معیار دولت ہو، جس میں عام پیشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جس میں رؤسا اسے برداشت نہ کرسکیں کہ مفلس اور غریب ان کے برابر بیٹھ جائیں ——

(۲) جس قوم کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے، اس پر غور و فکر کرنا کفر و الحاد ہے، اور

(۳) جس قوم میں معیارِ قومیت، رنگ، نسل، خون، وطن، زبان کا اشتراک ہو نہ کہ ایمان کا رشتہ۔

وہ قوم آخر الامر تباہ ہوکر رہتی ہے —— اب آگے بڑھیے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اور اہم بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھیئے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے، ایک رسول جس قوم کی طرف آتا تھا اس میں ہر قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں لیکن ان میں ایک خرابی اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس رسول کا مقصد صرف اس ایک خرابی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس معاشرہ کو تمام خرابیوں سے پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی علاج تجویز یا میکانکی طریق کار اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اس قوم کو اصولی تعلیم دیتا تھا جس سے ان کا اندازِ نگاہ بدل جاتے اور اس طرح ان کا معاشرہ ان خرابیوں سے پاک ہوجائے۔ یہ اصولی تعلیم کیا تھی؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر رسول، اپنی قوم کو یہی دعوت دیتا تھا۔ وہ دعوت کیا تھی؟ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ۔ (۷/۵۹) اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت، محکومی، فرماں پذیری اختیار کرو۔ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱/۲) اس کے سوا کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ یہ تھا ان کی ساری خرابیوں کا علاج، مع اس بنیادی خرابی کے جس کی طرف وہ

ان کی توجہ خاص طور پر سیدول کراتا تھا یا در کھیئے۔ قرآن کریم چیچک کا علاج ہر آبلہ پر پھایا رکھنے سے نہیں کرتا۔ اس سے مرض کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علامات مرض کے بجائے علتِ مرض کا ازالہ کرتا ہے اور جب علت کا ازالہ ہو جاتا ہے تو علامات خود بخود مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی، حتیٰ کہ انفرادی خرابیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ وہ برگ و بار ہوتی ہیں غلط نظامِ زندگی کا۔ لہٰذا، ان کا علاج بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اس غلط نظام کی جگہ صحیح نظام (جو وحی خداوندی پر مبنی ہو) نافذ کر دینے سے ہو سکتا ہے۔ یہی خدا کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہی آسمانی انقلاب لانے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا طریقِ کار تھا۔ اسی طریق کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

بہرحال ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کے ابدی اصول کے مطابق، طبقاتی تفریق معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوتی ہے ضمناً قرآن نے تاریخی سرگزشتوں کے سلسلہ کی ابتدا اس سے کی ہے۔ اور (یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ) اس سلسلہ کی آخری کڑی میں بھی اسے دہرایا گیا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرمؐ کی قوم (قریش) کے سرداروں نے بھی بعینہٖ یہی اعتراض کیا اور انہیں بھی بعینہٖ یہی جواب دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ۶/۵۲)، لیکن یہاں قرآن نے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بتایا کہ اس امتیاز سے تباہی کیوں آتی ہے۔ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ (۶/۵۳) یعنی یہ طبقات ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے فتنہ اور مصیبت کا موجب بنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن تک یہ بات تو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی کہ بالادست طبقہ کس طرح زیردست طبقہ کے لئے مصیبتوں کا موجب ہوتا ہے۔ وہ ان پر کیسے کیسے ظلم و ستم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی تھی کہ زیردست طبقہ بھی بالادست طبقہ کے لئے فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس زمانہ میں سامنے آئی ہے اور اب لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ طبقاتی امتیاز، نہ صرف زیردست طبقہ کے لئے باعثِ مصیبت ہے بلکہ یہ خود بالادست طبقہ کے لئے بھی فتنہ کا موجب ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔

یہ تھی داستانِ قومِ نوحؑ۔ اب آگے بڑھیئے۔

قومِ عاد

قومِ نوحؑ کے بعد قرآن کریم، قومِ عاد کی سرگزشت سامنے لاتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر، مصر و شام تک حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس قوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے جس سے وہ (یوں سمجھئے گویا) موجودہ زمانے کی مغربی اقوام کے مماثل نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قوت و حشمت اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام پر سرفراز تھی۔ قرآن کریم نے زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (۷/۶۹)، کہہ کر ان کی مادی وسعتوں اور توانائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وَلَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ۔ (۸۹/۸) کے اضافہ سے یہ بتایا ہے کہ اس کی ہمعصر اقوام میں کوئی اس کے ہمسر نہیں تھی۔ انہیں اَنعام و بنین اور جنات و عیون کی بخشائشیں بافراط حاصل تھیں (۲۶/۱۳۳-۱۳۴)، یعنی مال مویشی کی بھی کثرت اور پرہ جنبہ بھی بہت وسیع۔ لہلہاتے باغات اور

سرسبز و شاداب کھیتیاں بھی بکثرت اور چشموں کا آبِ مصفا بھی رواں دواں۔ یہی اس زمانے کی دولت اور قوت تھی جو اُس قوم کو اس فراوانی سے حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً (۴۶/۲۶) انہیں سمع و بصر کی قوتیں بھی حاصل تھیں اور قلب و دماغ کی صلاحیتیں بھی۔ یعنی، اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق، اشیائے فطرت کو مسخر کرنے اور ان سے مفید مطلب نتائج اخذ کرنے کی صلاحیتیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۲۹/۳۸) وہ جاہل اور بے بصر قوم نہیں تھی۔ دانا و بینا تھی، علم و ہنر سے بہرہ یاب تھی۔ ان کی تمدنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹) وہ ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ حکومت کرنی ہے۔ یہاں تک کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ (۲۶/۱۲۸) وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں تعمیر کرتی تھیں۔ ضمناً، یہاں قرآن کریم نے ایک لفظ کے اضافہ سے ان کی یادگاروں پر ایسی گہری تنقید کی ہے جس کی زد انہی کی یادگاروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر قوم کی یادگاروں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ وہ ایسی یادگاریں بناتے تھے جن کا افادی پہلو کوئی نہیں تھا۔ اس سے محض ان کی انانیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے اونچے مینار یا محکم سنگین اور فولادی چٹانیں، جن پر صرفہ تو اتنا زیادہ ہو لیکن قوم یا انسانیت کو اُن سے فائدہ کچھ نہ پہنچے۔ یعنی محض خود نمائی کی خاطر عبث و بے کار اسراف!

قومِ المجرمین

قرآن کریم نے اس قوم کے جرائم کی تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن اس نے جو کچھ اجمالاً کہا ہے اس میں ساری تفاصیل سمٹ کر آگئی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قومِ المجرمین تھی۔ عربی زبان میں جرم کہتے ہیں کسی کے درخت کا پھل کاٹ کر اور توڑ کر اپنے ہاں لے آنا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ آپ دیکھئے کہ اس ایک لفظ میں اس قوم کے نظام کا پورے کا پورا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں سلب و نہب، استحصال (EXPLOITATION) و استعمار، معمول ہو جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر ممکن حربہ سے لوٹ لیا جاتے۔ جس میں کیفیت یہ ہو کہ:

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

محنت کوئی کرے، اس کا حاصل کوئی اور لے جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اِذَا بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۲۶/۱۳۰)، وہ کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کی گرفت اس قدر محکم ہوتی تھی کہ کوئی اس سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے حکمران جَبَّارٍ عَنِيْدٍ تھے (۱۱/۵۹) بڑے ظالم اور جابر، بڑے سرکش اور متکبر۔ دوسری جگہ ہے۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱/۱۵)، انہوں نے ناحق ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی اور نخوت اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو اس کی جراٴت کرے ہم اس کی آنکھ نکال دینگے۔ ہماری قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جو ہمارے راستے میں آئے گا ہم اُسے کچل کر رکھ دیں گے۔

حضرت ہودؑ

یہ تھی وہ قوم جس کے ہاتھوں مظلوم و مقہور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ جب ان کے مظالم انتہا تک پہنچ گئے تو ان کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے۔ تاکہ انہیں اس روش سے باز رکھا جائے۔ انہوں نے آکر ان سے کہا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر قوانینِ خداوندی

کا اتباع کرو۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (۷/۶۶)، اس قوم کے اکابرین نے کہا۔ دیکھئے یہاں بھی وہی لفظ اَلْمَلَاُ آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست بھرپور حاصل تھا۔ انہوں نے نشۂ قوت میں بدمست ہو کر کہا کہ میاں (معاذ اللہ) ہوش کے ناخن لو۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ نظام جس کا نتیجہ دولت و حشمت اور قوت و شوکت کی اس قدر فراوانیاں ہیں، کبھی تباہی اور بربادی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔ ان پر جذبات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انہیں کوئی شے اپنے اصلی رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں اپنا سیاہ نامۂ اعمال بھی نہایت درخشندہ اور مزین نظر آتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب ذہنیت ایسی ہو جائے تو پھر کسی ناصح کی نصیحت کو کون سنتا ہے؟ انہوں نے حضرت ہودؑ کی نصیحت و موعظت سے اعراض برتا، تکذیب کی، سرکشی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ تباہی تھا۔ اس تباہی کا نقشہ قرآن کریم نے بڑے عبرت انگیز انداز میں کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ اے قوم مخاطب! تم جو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر اترا رہے ہو گوشِ ہوش سے سنو کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ۔ ہم نے انہیں ایسا تمکن و تسلط عطا کیا تھا، وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو تمہیں بھی حاصل نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ لوگ جاہل تھے اس لئے اپنی جہالت کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً۔ انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت اور سمجھنے سوچنے کی اہلیت عطا کی تھی۔ وہ دیدہ ور اور باشعور تھے، صاحبِ علم و ہنر تھے۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، مستقل اقدارِ سماوی سے اعراض برتا، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کیا تو ان کا علم و ہنر کسی کام نہ آیا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سب بیکار ثابت ہوئیں۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶)۔ اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہلاک ہو گئے۔ انہیں ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔ اور یہ بات کچھ انہیں سے مخصوص نہیں وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (۴۶/۲۵)، ہر مجرم قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ان کی ہنرمندیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

قومِ عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے، وہ نظامِ زندگی جس میں دوسروں کی محنت کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ جس میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہدفِ جور و ستم بنایا جائے جس میں سلب و نہب اور (EXPLOITATION) قومِ غالب کا شعار ہو، وہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ نظام بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حامل قوم بھی تباہ و برباد۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے، یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے۔

اب آگے چلئے:

* * *

قوم ثمود

قدیم زمانے میں، حجاز سے جو شاہراہ شام کو جاتی تھی، اس پر، وادئ قریٰ میں، ایک نامور قوم آباد تھی جو تاریخ میں ثمود کے نام سے متعارف ہے۔ زمانہ ان کا قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال (ق۔م) کا بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق، اس قوم کو بھی بڑا تمکن حاصل تھا۔ (۷/۷۴)، پرفضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف اور شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، وہ میدانوں میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں میں محکم قلعے بناتے (۷/۷۴، ۱۵/۸۲، ۲۶/۱۴۹)

معیشت گلہ بانی

قرآن کریم نے ان کا بنیادی جرم، اور ان کے نظام کی اساسی خرابی وہ بتائی ہے جسے خود ہمارے زمانے میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار گلہ بانی پر تھا ۔ وہ مویشی پالتے اور ریوڑ چراتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گلہ بانی کے لئے وسیع و عریض چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ضرورت لاینفک ہے اور یہ کچھ انہیں فراوانی سے حاصل تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۲۶/۱۵۲) ملک میں فساد برپا کرتے تھے۔ اس فساد کی تفصیل غور طلب ہے۔ سرداران قوم ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنی ذاتی ملکیت جتا کر انہیں اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور کمزور اور غریب لوگوں کے جانور بھوکے پیاسے رہتے ..... ان کی طرف حضرت صالحؑ خدا کا یہ انقلابی پیغام لے کر آئے کہ یہ چراگاہیں اور چشمے، ربوبیت عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مفت ملتے ہیں، اس لئے انہیں تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر دوسرے انسانوں اور ان کے مویشیوں کو رزق سے محروم کر دے۔ ظاہر ہے کہ اکابرین قوم اس انقلابی دعوت کو کیسے قبول کر لیتے؟ چنانچہ، جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا ہے، مظلوم اور نادار طبقے نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور سرداران قوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (۷/۷۵) تکبر و نخوت کے نشہ میں مدہوش سرداران قوم ان لوگوں سے پوچھتے تھے جنہیں انہوں نے بے حد کمزور اور ناتوان بنا رکھا تھا اور جو حضرت صالحؑ کے ساتھ ہو گئے تھے کہ کیا تم واقعی دل سے یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا پیغمبر ہے۔ وہ جواب میں کہتے کہ ہم اسی لئے اس کے ساتھ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے، ورنہ یہ بھی تو تم ہی میں سے ایک تھا۔ یہ اس قسم کی دعوت لے کر کیوں اٹھتا۔ ادھر سے ہٹ کر وہ خود صالحؑ سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۔ (۲۶/۱۵۳) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ کوئی صاحب عقل و ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ ان زمینوں پر ہمارے حقوق مالکانہ سب ناجائز ہیں اور ان ناداروں کو جو اپنی روٹی ٹکر کے لئے ہمارے محتاج ہیں، ان پر اسی طرح تصرف کا حق حاصل ہے جیسا ہمیں۔ ! اس سے تو معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ اُن سے کہتے کہ یَا صَالِحُ ۔ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا ۔ (۱۱/۶۲) تو تو ہم میں سے بڑا عقلمند آدمی تھا، قبیلہ کا ممتاز رکن تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قبیلہ کی دولت و حشمت کو برباد کر دینے کی سوچ رہے ہو! لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغامبر انقلاب پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دعوت پر جمے رہے اور دوسری طرف سے مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ اس مقام پر قرآن کریم

نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ اس معاشرہ میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں، اور بات دو چار دس کی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے تو سوچا کہ ان کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی! — سینہ تمام داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم — اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ بیشک قوم میں یہ خرابیاں عام ہیں، لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں

قوم کے سرغنے فساد کی جڑ ہوتے ہیں

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ۔ (۲۷/۴۸) مملکت کے مرکزی مقام میں صرف نو سرغنے (لیڈر) ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہی قوم کو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کا بندوبست کر لو تو سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم دو لفظوں میں کتنی عظیم حقیقت کو بے نقاب کر گیا ہے۔ عوام نہیں بگڑتے۔ یہ چند خواص ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر ان میں بگاڑ پیدا کرتے اور انہیں فساد پر اکساتے رہتے ہیں!

بہرحال، مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ ان نو سرغنوں نے تہیہ کر لیا کہ حضرت صالحؑ کے مکان پر ہلہ بول کر انہیں اور ان کے اہل کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے وارثوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں اس قتل کا کوئی علم نہیں (۲۷/۴۹)۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سازش بھی ناکام رہ گئی اور حضرت صالحؑ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ وہ لوگ مجبوراً ان کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اب دیکھئے کہ اس مصالحت کی شرط کیا تھی۔

آپ نے ان سے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ مویشی ہمارے ہیں اور یہ زمینیں بھی ہماری ہیں، اس لئے ہمارے مویشی ہماری زمینوں میں ہی چگتے چریں گے۔ اس کے مقابل میں وہ ان لوگوں کے مویشی ہیں جن کی یہ زمینیں نہیں۔ اس لئے وہ ان زمینوں میں نہیں آ سکتے۔ یہ تمہاری بھول ہے اور اس کی بنیاد اس غلط نگہی پر ہے کہ تم نے جانوروں اور زمینوں کی نسبت انسانوں کی طرف کر رکھی ہے۔ اس لئے "میری اور تیری" کے پھیر میں پڑ گئے ہو۔ درحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ یہ جانور سب خدا کی مخلوق ہیں — تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی — اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ لہٰذا، چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے کہا کہ بہت اچھا۔ لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہیئے۔ وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔ نہ زید کی ہے نہ عمر کی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو آزاد چرنے چگنے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔ اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔ قرآن کریم کے الفاظ میں — هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ .... (۷/۷۳)۔ یہ

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے

ناقۃ اللہ ہے اور وہ ارض اللہ۔ ناقۃ اللہ، ارض اللہ میں چرے چگے گی۔ اللہ اللہ خیر سلّا — آپ غور کیجئے، قرآن کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے پیش کر دیا ہے جو تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وجہ نزاع و فساد رہا ہے اور اب تک ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے، اپنے پیش نظر خاص واقعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے حضور

نبی اکرمؐ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ

> زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔ اس لئے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔

سردارانِ قومِ ثمود نے کہنے کو تو یہ معاہدہ کر لیا لیکن وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ وہ، اور قوم کا غریب طبقہ ایک سطح پر آجائیں۔ وہ جوشِ غضب میں پاگلوں کی طرح اُٹھے اور اس اونٹنی کو جو ان کے معاہدہ کی ٹھوس نشانی تھی، ہلاک کر دیا اور اپنے اسی سابقہ نظام پر قائم ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے باطل نظام کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

تباہی

قرآن کریم نے اس تباہی کا نقشہ دو لفظوں میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت کی ساری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا۔ خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بنا پر، ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہو گئی[1]۔ اور اس کے بعد ہے۔ فَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (۹۱/۱۱-۱۵) خدا کا قانونِ مکافات جب ظالموں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کانپا کرتا۔ قانون کی محکمیت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ عواقب سے نہ ڈرے۔ عواقب سے ڈرنا مصلحت کوشی ہے اور مصلحت کوشی اور عدل، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی قوم مخاطب سے کہتا ہے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا۔ یہ ان کے گھر تمہارے سامنے موجود ہیں ویران، خالی، اُجڑے ہوئے۔ یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۲۷/۵۲) قومِ ثمود کی اس سرگزشت میں، اربابِ علم و بصیرت کے لئے، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی روشن دلیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ

> جو قوم، خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق کو انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دیدے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی، اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہوگا۔

حیاتِ آخرت سے انکار

اس سلسلہ میں قرآن کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں اختیار اور رائج کرتی ہیں جن کا نظریۂ حیات یہ ہو کہ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ۔ (۲۳/۳۷) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریۂ زندگی یہ ہو جائے تو پھر وہ کون سی چیز ہے جو اسے سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب و استحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور دوسری طرف حیاتِ آخرت سے

---

[1] چونکہ معاشرہ میں ناہمواریاں زمین کی بنا پر پیدا کی گئی تھیں، اس لئے قرآن نے تباہی کا استعارہ بھی زمین ہی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو۔ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اس تصورِ حیات کیساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیاد وہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے
جستۂ اورا اساسِ محکمے

تم جو ایک عالمگیر نظام کی آرزو لے کر اٹھے ہو، کیا تم نے اس کے لئے کسی محکم بنیاد کو بھی تلاش کر لیا ہے۔

اب آگے بڑھیئے اور قومِ مدین کی طرف آ جائیے۔

(۷)

قومِ مدین

حضرتِ ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ یہ قوم حجاز کے شمال میں، شام سے متصل علاقے میں سکونت پذیر تھی۔ حضرت شعیبؑ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا زمانہ قریب ۱۴۰۰ (ق۔م) قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تصریحات کے مطابق یہ قوم تجارت پیشہ تھی۔ اور اس شعبہ میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کر رکھی تھی۔ لیکن ہر سرمایہ پرست تجارت پیشہ قوم کی طرح ان کا انداز بھی یہ تھا کہ

سرمایہ پرستوں کا نظامِ تجارت

وہ "لیتے زیادہ تھے اور دیتے کم تھے"۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک طرف محنت کش کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیں اور دوسری طرف ہر حیلہ کاری اور فریب دہی سے گاہک کی جیب بھی کاٹ لی جائے۔ قومِ ثمود میں اگر نظامِ سرمایہ داری کا عفریت زمینداری کی شکل میں ملکوب تھا، تو قومِ مدین میں، وہ سوداگری کے پیراہن میں پاکۂ زن۔ یہ تھی وہ قوم جس کی طرف، آسمانی انقلاب کے پیامبر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآنِ کریم نے ان کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز ایک عمیق، بصیرت افروز نکتہ سے کیا ہے۔

حضرت شعیبؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان، لوگوں کو الٰہیتوں کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے، سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ۔ دیکھو! لینے ماپ اور تول کے پیمانے کم نہ رکھو۔ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ـــ ٹھیک ٹھیک ماپو۔ صحیح صحیح تولو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (۸۵/۱۱)۔ گاہک کو اس کی ادا کردہ قیمت کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو، نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ بارڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو۔ اَوْ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ (۸۶/۷)۔ اور جو دیانت دار انسان تمہیں اس روش سے روکے، اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔ اور اس طرح معاشرے میں ناہمواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیبؑ سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے صلوٰۃ کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت

یہ صلوٰۃ کیسی ہے؟

دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن يٰشُعَيْبُ! اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ..... اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا

مَا نَشٰٓؤُا - (۱۱/۸۷)، تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لاسکیں۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے...... یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں، دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آرہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقائد کس قسم کے رکھتے ہیں۔ اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے (اسے دین کہتے ہیں)، قومِ شعیبؑ کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا، اسی لئے وہ حضرت شعیبؑ کی اُس دعوت پر متعجب اور معترض تھے جس کی بنیاد دین پر تھی۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ عام طور پر ممتاز گھرانوں کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے جب وہ اس روش کی مخالفت کرتے تھے جو خود ان کے اپنے گھرانے اور اسی جیسے دوسرے گھرانوں میں متوارث چلی آتی تھی، تو غیر تو ایک طرف، خود اپنوں کو بھی ان پر تعجب ہوتا تھا کہ یہ عجیب پاگل ہے جو اپنے گھر کی دولت و حشمت اور شرف و عزت سے ہاتھ دھو کر پڑ رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی ایک ذی اثر گھرانے کے فرد تھے۔ اسی لئے قوم کے اکابرین نے ان سے کہا کہ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ - (۱۱/۹۱)۔ اگر ہمیں تمہارے خاندان اور برادری کا پاس نہ ہوتا تو ہم تمہیں کبھی کا سنگسار کرچکے ہوتے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱/۹۲)، تم عجیب لوگ ہو جنہیں خدا کے قانونِ مکافات کا تو کچھ ڈر نہیں لیکن میری برادری کا پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

اُدھر سے ہٹ کر انہوں نے اُن لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا جنہوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہیں تھیں۔ ان اَلْمَلَاُ اَلْقَوْمِ نے ان سے کہا کہ تم اس انقلابی شخص کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے (۷/۹۰)، لیکن انہوں نے بھی ان کی ایک نہ مانی۔

بہرحال، انہوں نے اپنے نظام کو نہ بدلا تاآنکہ وہ (قرآن کے الفاظ میں)، اس طرح ان کے اوپر آ کر گرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے اور ان کے گھر اس طرح اُجڑ کر رہ گئے کَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۹۵) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

یہ تھا انجام اس نظامِ معیشت کا جس میں تجارت، خون آشامی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تجارت کا تعلق شہری معیشت سے ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کی دیہاتی زندگی کا تعلق ہے، وہاں وہی زمینداری نظام رائج تھا جسے ہم قومِ ثمود کے ہاں دیکھ آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے سامنے نقشۂ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسٰےؑ میں آتی ہے۔

مدین کا پیاؤ

جب حضرت موسٰےؑ زمانہ قبل از نبوت میں، فرعون کے پنجۂ استبداد سے بچنے کی خاطر مصر سے بھاگے ہیں تو مدین کے علاقہ میں سے گزرا ہے ایک پیاؤ کے قریب آ کر، درختوں کے سایہ میں سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے پیاؤ پر اوروں کے مویشی پانی پی کر چلے جا رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جن کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پیاؤ کی طرف دوڑ دوڑ کر جانا چاہتی ہیں لیکن وہ لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسٰےؑ سے نہ رہا گیا اور ان لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو اس طرح روک کیوں رہی ہو؟ انہوں

نے کہا کہ ان مویشیوں کے چرواہے زور آور ہیں اور ہماری حالت یہ کہ گھر میں کوئی مرد نہیں بجز ایک باپ کے، جو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر چلے نہیں جاتے، ہم اپنی بھیڑوں کو کیسے آگے بڑھنے دے سکتی ہیں۔ یہ سن کر حضرت موسےٰ نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ ـــ بہر زمینے کہ رفتیم آسمان پیداست۔ ـــ ارضِ فرعون سے بھاگا تھا کہ وہاں کمزوروں اور غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں۔ یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی کمزوروں اور بے کسوں کی وہی حالت ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھے۔ آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درختوں کے نیچے آکر بیٹھ گئے اور بحضورِ رب العزت عرض کی کہ:۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

یہ تھی قومِ مدین کی دیہاتی زندگی، اور وہ تھی اُن کی شہری زندگی۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟

* * *

قومِ لوط

اس وقت تک جن اقوام کی سرگزشت ہمارے سامنے آئی ہے وہ اپنے غلط سیاسی یا معاشی نظام کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی قوم آتی ہے جس کا جرم خود ان کے نام کے اندر مضمر ہے۔ یہ ہے قومِ لوطؑ جس کی نسبت سے لواطت کی نہایت مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔ ان کے مرکزی مقام کا نام سدوم تھا جسے انگریزی میں (SODOM) لکھتے ہیں۔ (SODOMY) کے لفظ کی نسبت اسی کی طرف ہے۔

قرآن کریم عصمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کا شمار مستقل اقدار میں کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ عصمت خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوانوں میں اس کا تصور نہیں ہوتا۔ لہٰذا جسے عصمت کا احساس نہ رہے وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب جنسی جذبہ کی تسکین بدنہادی (PERVERSION) تک پہنچ جائے تو وہ مقام بَلْ هُمْ اَضَلُّ کا ہوتا ہے۔ یعنی حیوانوں سے بھی زیادہ پست سطح۔ کیونکہ حیوانوں میں (SEX-PERVERSION) نہیں ہوتی۔ یہ جرم انفرادی طور پر بھی کچھ کم شرمناک نہیں ہوتا لیکن جب یہ کسی معاشرہ کا عام معمول بن جائے تو اسے انسانی معاشرہ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جب قومِ لوط کی سرگزشت ہمارے سامنے آتی تھی تو ہم حیران رہ جاتے تھے کہ وہ قوم، پوری کی پوری، اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہو گئی۔ لیکن اب یہ بات چنداں وجہ حیرت نہیں رہی۔ قومِ لوطؑ کی سرگزشت تو آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے۔

دورِ حاضرہ کی حالت

آج اس بیسویں صدی کے زمانۂ علم و بصیرت میں دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن قوم' برطانیہ نے حال ہی میں وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رو سے لواطت (HOMO-SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے[1]۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ ہم نے تو انسان کو حسین ترین ہیئت میں پیدا کیا تھا۔ لیکن یہ کمبخت، اپنی حرکات سے اپنے آپ کو پست سے پست سطح پر لے جاتا ہے۔

---

[1] اب امریکہ سے اس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں لڑکوں (غلمان) کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اس قوم کی بے حیائی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت لوطؑ نے انہیں اس انسانیت سوز فعل سے باز رہنے کی تلقین کی تو بجائے اس کے کہ انہیں اس پر کچھ ندامت ہوتی، وہ آپس میں کہنے لگے کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۔ (۲۷/۵۶)، "یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پاکباز سمجھتے ہیں۔ انہیں بستی سے نکال باہر کرو۔" اس پوری قوم کیطرف سے اس قسم کی باتیں سن کر حضرت لوطؑ حیرت رہ جاتے تھے اور انتہائی تعجب اور تاسف سے کہتے تھے کہ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۔ (۱۱/۷۸)، کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے! لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کے ہلاکت آفرین جراثیم سے قوم کا کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہا تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اس درجہ عام ہو جائیں تو اس کی تباہی میں کون سی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی اور اس طرح تباہ ہوئی کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲)، اس کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں۔ چنانچہ بحر مئیت (DEAD-SEA) کا مہیب اور لرزہ فگن ماحول اور اس میں بکھرے ہوئے کھنڈرات کی ویرانیاں، آج بھی اس سوختہ بخت قوم کے عبرت انگیز انجام کے مرثیہ خواں ہیں۔

اقوامِ مغرب کی عریاں اور آبرو باختہ تہذیب سے متاثر ذہنیتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا، قوموں کی موت وحیات سے کیا واسطہ! ان لوگوں کو وحی کی سند سے کچھ سمجھانا بے کار ہے۔ وہ اسے سند ملتے ہی نہیں۔ لیکن مغربی محققین کو تو یہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ان محققین سے پوچھ لیں کہ ان کی تحقیق اس باب میں کیا کہتی ہے۔ زیادہ نہیں تو وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ڈاکٹر (J.D. UNWIN) کی کتاب (SEX & CULTURE) اٹھا کر دیکھ لیں جسے انہوں نے اسی غیر مہذب قدیم قبائل، اور سولہ مہذب اقوام کی جنسی زندگی کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص ۲۰۳)

اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں (ص ۳۴۳)

لہٰذا، جنسی ضوابط سے بیباک ہو جانے والا معاشرہ اگر سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو اسے اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کا آخری نتیجہ قومی تباہی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔[1]

(۰)

قومِ فرعون

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے۔ لیکن قرآن کریم نے انہیں تین اصولی اور

---

[1] اس کی تفصیل "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں ملے گی۔

اساسی شقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی استبداد ملوکیت کی قہرسامانیاں جن کا مجسمہ فرعون تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں جن کا پیکر ہامان تھا اور نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں جن کا نمائندہ قارون تھا۔ یہ تینوں یکجا اور ان کے آہنی پنجے میں گرفتار قوم بنی اسرائیل کی شکل میں، تڑپتی، پھڑکتی انسانیت۔ دوسری طرف قرآن کریم نے ان تینوں گوشوں کے جرائم کا تذکرہ اس شرح و بسط سے کیا ہے کہ میری تصنیف 'برقِ طور' کے قریب اڑھائی سو صفحات بمشکل انہیں اپنے دامن میں سمیٹ سکے ہیں ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کو اس قدر مختصر وسعت میں سمیٹنا ناممکن ہے اس لئے ان کے سرسری تذکرہ پہ اکتفا کیا جائے گا۔

پارٹی بازی

جیسا کہ نظامِ ملوکیت کا خاصا ہے، فرعون نے قوم بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کہیں ایک مرکز پہ جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائیں، کرتا یہ تھا کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴)، ان میں پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرتا رہتا۔ پھر اس کی چال یہ تھی کہ يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ (۲۸/۴)، وہ اس قومِ محکوم کے جن افراد میں جوہرِ مردانگی کے آثار دیکھتا انہیں کچل دیتا اور ان کے نامرد طبقے کو اپنا مقرب بناتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس نے رزق کے سب سرچشمے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے اس لئے یہ مظلوم و محکوم قوم نانِ شبینہ تک کے لئے اس کی محتاج تھی۔ اسی لئے اس نے جب ان میں ذرا سی سرکشی کے آثار دیکھے تو گرج کر کہا کہ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳/۵۱)۔ تم جانتے نہیں کہ یہ ملک میرا ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ میں تمہیں بھوکا مار دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴)۔ میں تمہارا پالن ہار ہوں اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ تم پر حکومت کروں۔ جو جنہیں رزق دیتا ہے وہی ان کا آقا اور خدا ہوتا ہے۔

اُن داتا

آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذہنیت سے کس طرح تمرّد و نخوت کے شعلے ابھرتے اور سرکشی اور انانیت کے طوفان اٹھتے ہیں۔

یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کو یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴) فرعون کی طرف جاؤ اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ (۲۳/۴۵-۴۶) "جاؤ فرعون اور اس کے ارکین مملکت اور سرداران قوم کی طرف جو تکبر و نخوت کے پیکر ہیں" قرآن کریم نے اس قوم کو کہیں مجرمین کہا ہے کہیں ظالمین۔ کہیں مفسدین کہا ہے کہیں فاسقین۔ یعنی ظلم و استبداد اور سرکشی و حدود فراموشی کے جس قدر جرائم ہو سکتے تھے، وہ سب ان میں موجود تھے۔

حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف آئے اور اس سے کہا کہ میں خدائے رب العالمین کا پیغامبر ہوں اور تم سے صرف اتنا مطالبہ کرنے کے لئے آیا ہوں کہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۱۷)، بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ دوسرے مقام پر جو الفاظ آئے ہیں وہ اس پیغمبرانہ مشن کی اور بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۴۴/۱۸) کہ خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دے کہ میں انہیں خدا کی زمین میں لے جاؤں جہاں وہ خدا کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہاں عباد اللہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی۔ یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنے فیصلوں کا محکوم بنائے۔ انسان صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اپنے جیسے انسانوں

کا غلام بننے کے لئے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ کس قدر صاف، سیدھا اور مبنی برحق و انصاف تھا۔ انہوں نے نہ فرعون سے اسکی بادشاہت چھین لینے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی حکومت میں شریک ہونے کا دعویٰ۔ کہا صرف یہ تھا کہ اس مظلوم قوم کو اجازت دیدو کہ یہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک قوم غالب اپنے ہاں کی اقلیت کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دے تو وہ پھر حکومت کس پر کرے؟ (ضمناً، یہ بعینہٖ وہی پوزیشن تھی جو تقسیم ہند سے پہلے ہمارے اور ہندوؤں میں بنائے نزاع تھی۔ ہندو بھی اسی لئے ہماری علیحدگی پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مسلمان وہاں سے چلے گئے تو وہ حکومت کس پر کرے گا)

احسانات کی یاد دہانی

فرعون نے اس مطالبہ کی مخالفت کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوزیشن وہاں بڑی مؤثر اور حضرت موسیٰؑ کا مقام خاصا بلند تھا۔ اسی لئے فرعون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا اور اس کی بجائے اس نے سیاستِ ملوکانہ سے کام نکالنا چاہا۔ اس نے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم اس کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کا کیا جواب دیا۔ آپؑ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۲۲)، تم نے مجھ پر جو ذاتی احسانات کئے، ان کی یاد تو دلاتے ہو، لیکن اپنے اس سب سے بڑے "احسان" کی یاد کیوں نہیں دلاتے کہ تم نے پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ پر ذاتی نوازشات کی قیمت میں بنی اسرائیل کی آزادی خرید لو۔

برو، ایں دام را پیش دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جب وہ اپنے اس حربے میں ناکام رہا تو اس نے پھر وہ تدبیر اختیار کی جو حکمتِ فرعونی کا آخری حربہ ہوتی ہے۔ یعنی اس نے جھوٹے پراپیگنڈہ سے عوام کو برانگیختہ کرنا چاہا کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ۔ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۔ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۲۶/۳۴-۳۵) فرعون نے اپنے اراکینِ مملکت سے کہا کہ یہ شخص بہت بڑا فریب کار نظر آتا ہے۔ مطالبہ تو بظاہر یہ کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جائے لیکن درحقیقت اس کا پلان یہ ہے کہ تمہیں اس مملکت سے نکال باہر کرے اور خود حکمران بن بیٹھے۔ کہو! اس فتنے کو فرو کرنے کے سلسلہ میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟

مذہبی پیشوائیت

اراکینِ مملکت نے کہا کہ اس کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کارگر نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے جذباتی مسئلہ بنا دیا جائے اور اسے مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ملا کر عوام کو اشتعال دلایا جائے کہ یہ شخص اپنا مذہب تم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ فرعونؔ اور اسکے اراکین کے بجائے، ہامانؔ اور اس کے جنود (مذہبی لشکروں) کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو قرآن کے استعارے کے مطابق رسیوں کے سانپ بنا بنا کر عوام کو فریب دیتے تھے۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیسا ہوتا ہے، اور ان خدائی فوجداروں کے پیش نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت کرنے کے لئے، لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں ملے گا کیا؟ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کریم کے

بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰؑ کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا تھا۔ (۲۷/۱۴)

لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جرأت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ کا دعویٰ سچا ہے۔ اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے لیکن (بغرضِ اختصار) اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰/۷۱) "تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی۔ اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں۔" اس سے ظاہر ہے کہ استبداد ملوکیت، آزادیٔ خیال و عقاید کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلیٔ عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔

قارون

یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔ باقی رہا قارون، سو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ خود قومِ موسےٰؑ میں سے تھا۔ یعنی بنی اسرائیل ایک طرف تو غیر قوم (قومِ فرعون) کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف، خود اپنے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس نظام میں دسیسہ کارئ ملوکیت، اطلہ فریبئ مذہبی پیشوائیت اور خون آشامئ سرمایہ پرستی اس حد تک پہنچی ہو، وہ نظام اس قوم کو لے کر ڈوبے گا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (۲۸/۶)، فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں نے اپنی آنکھوں سے اپنا وہ انجام دیکھ لیا جس سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور بنی اسرائیل نے آزادی کی فضا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

——— (۰) ———

قوم بنی اسرائیل

اور اب ہم اس قوم کی طرف آتے ہیں جسے فرعون کے مظالم سے رستگاری کے بعد آزادی کی نعمت سے نوازا گیا تھا۔ قرآن کریم نے اس قوم کی داستان بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے اور ان کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جن کے نتیجہ میں وہ شوکت و حشمت کی اس قدر بلندیوں تک پہنچنے کے بعد اس طرح ذلیل و خوار ہوئی کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن نے سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ چونکہ اس قوم کو یہ مملکت محض ان کے قائد (حضرت موسیٰؑ) کے دعویٰ کی صداقت اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی اس لئے اسے اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ وہ (تورات کے الفاظ میں) قدم قدم پر حضرت موسےٰؑ سے جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ "تو ہمیں کہاں مرنے کے لئے لے آیا ہے۔ ہم مصر ہی بہت اچھے تھے۔ مصریوں کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور پیٹ بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ ہم سے ہاتھ اٹھا کہ ہم پھر وہیں چلے جائیں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے ہزار درجے بہتر ہوگا۔"

بنی اسرائیل اور ہم

عدمِ گنجائش مانع ہے ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ بنی اسرائیل کی غلامی، غلامی کے بعد آزادی اور (اس طرح مفت میں ملی ہوئی آزادی) کے بعد، ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت، اور اس کے عبرت آموز مظاہر سے، کس طرح ہماری آزادی اور آزادی کے بعد ہماری حالت کے ہو بہو عکس ہیں۔ اس داستان کو پڑھیے تو یوں نظر آتا ہے کہ مکان و زمان کی

تبدیلی کے ساتھ وہ گویا خود ہماری کہانی ہے۔

بہرحال، جب حضرت موسیٰؑ، ان کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آ کر خدا سے فریاد کرتے کہ اس قسم کی قوم کا کیا کروں، تو انہیں جواب ملتا کہ یہ قوم غلامی کی فضا میں پرورش یافتہ ہے، اس لئے ان کی ذہنیت بدلتے ہی بدلے گی۔ تم ان کے بڑے بوڑھوں کو تو مرنے دو، لیکن ان کی آنے والی نسل کی پرورش اور تربیت اپنے زیرِ نگرانی کرو۔ چنانچہ حضرت موسےٰؑ نے ایسا ہی کیا، اور جب یہ نئی نسل پروان چڑھی تو اس نے مملکتِ خداداد کو مستحکم ہی نہیں بلکہ اسے سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ ان کے عروج اور ترقی کی چمک دمک سے ایک عالم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں وہ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جو دولت اور قوت کے غلط استعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں، تو وہ اس طرح تباہ ہوئی کہ اس کی نظیر بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی پہلی تباہی بابل کے بادشاہ، بخت نصر کے ہاتھوں (قریب ۵۸۶ ق۔م میں) اس طرح ہوئی کہ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور عام قتل و غارت گری کے بعد، جو یہودی باقی بچے، انہیں ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر بابل لے گیا۔ جہاں وہ قریب ایک سو سال تک غلامی کی بدترین مصیبتوں کا شکار رہے۔ لیکن انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ایران کے خدا ترس حکمران، سائرس (ذوالقرنین) نے، انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلا کر، دوبارہ یروشلم میں لا بسایا۔ اس کے بعد، ان پر پھر وہی خرابیاں عود کر آئیں تو آخری حجت کے طور پر، ان کی طرف حضرت عیسیٰؑ جیسا عظیم پیغامبرِ انقلاب مبعوث ہوا۔ لیکن انہوں نے جب ان کی دعوت کی مخالفت کی اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو ان کی آخری تباہی، رومیوں کے گورنر طائیٹس کے ہاتھوں (۷۰ء میں)، اس طرح عمل میں آئی کہ وہ قریب دو ہزار سال تک خانماں خراب، بے گھر بے در، زمانے کی ٹھوکریں کھاتے پھرے، تا آنکہ اب انہیں، مغربی طاقتوں کے تصدق، دھاندلی سے فلسطین میں رہنے کا ٹھکانہ ملا۔

خرابیوں کی فہرست

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے ان کے جرائم کی فہرست بڑی تفصیل سے دی ہے لیکن (بغرضِ اختصار) یہاں ان میں سے صرف ان جرائم کو سامنے لایا جاتا ہے جو زیادہ نمایاں تھے۔ مثلاً:-

(۱) ان کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)

(۲) نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد، ربوٰ پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربوٰ کا چلن عام تھا حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۴/۱۶۱)

(۳) ربوٰ کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۴/۱۶۱)؛ (۹/۳۴)۔ اس سلسلہ میں، ان کی ہوسِ زر پرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآنِ کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور ہے بھی یہ بھائی۔ اس کے پاس ننانویں بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو۔ تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ سمیٹ کر، سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ و خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دلنشیں انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے، اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو۔ اور

اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمے دار تم خود ہو۔ یاد رکھو تمہارے صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ۔ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹)، اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرین ملت (لیڈران کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں جو وہ کر کے نہ دکھائیں۔ لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ (۳/۱۸۸)

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء و مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا (۹/۳۱) کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ:-

ا۔ وہ غرور، نخوت اور تکبر و تمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جاتی تو وہ اسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۴۰/۸۳)

ب۔ مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر جس قسم کا چاہو فتوے لے دیتے تھے (۲/۱۷۴)، اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

ج۔ اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی طرف دعوت دے۔ (۹/۳۴)

د۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی اور ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی (۴۲/۱۴) ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۲۳/۵۳)

ہ۔ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

س۔ وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو، جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے (۲/۸۰)، تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو، وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۵/۱۸)

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون کی طرف سے گریز کی راہیں نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۷/۱۶۳-۱۶۴)

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی، اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی (۲/۹۶؛ ۲/۲۴۳) نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی

دیتا تو وہ بھیڑوں، بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے۔ (۲/۲۴۳)

(۱۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے۔ جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷) اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے (۲/۲۴۹)

یہ تھی اس قوم کی حالت جب 'خدا کی آخری حجت' اور بنی اسرائیل کا آخری پیغامبر حضرت عیسےٰؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے۔

حضرت عیسےٰؑ

حالت اُس وقت یہ تھی کہ یروشلم پر حکومت تو رومیوں کی تھی لیکن بنی اسرائیل پر اقتدار مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ یہی وجہ ہے جو آپ انجیل میں دیکھیں گے کہ حضرت عیسےٰؑ کی تلقین و تو بیخ کا سارا رخ ہیکل کے انہی پجاریوں کی طرف تھا۔ دیکھئے۔ وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک 'حق گو پیامبر انقلاب' کی طرح اُن سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتلانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مَقدِس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مَقدِس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے سونا یا مَقدِس جس نے سونے کو مُقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو ——— جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔۔۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟

(متی باب ۲۳ - آیات ۳۶-۱)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو! یہ فقیہہ اور فریسی جو موسےٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔۔۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علماء و مشائخ کی حالت' اور یہ تھا وہ مشن جسے لے کر حضرت مسیحؑ آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا جو خدا بنے بیٹھے تھے، اس تنقید کو کس طرح گوارا کر لیتے۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہارے عقاید خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں

کی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس میں لکھا ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے . . . تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائینگے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائینگے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

آپ نے غور کیا، عزیزانِ من! کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت سے خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دین کے نظام میں مذہبی و سیاسی دونوں دوائر، حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

> اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں۔ بس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جائے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برناباس ص ۱۲۸)

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینک چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ مرتب کیا اور اس جرم کی پاداش میں ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ وہاں کے مروجہ قانون کی رو سے ہیکل کے پجاری، موت سے کم ہر قسم کی سزا خود دے سکتے تھے۔ لیکن موت کی سزا کی توثیق حکومت سے کرانی پڑتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے رومیوں کے گورنر سے فتویٰ پر دستخط کرا لئے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ حضرت مسیحؑ کا نہیں بلکہ خود ان کے اپنے قتل کا محضر نامہ (PEATH WAPRAT) ہے جس پر وہ دستخط کرا رہے ہیں۔ وہ قتل نامہ جس پر قریب ستر سال بعد (۷۰ء میں) خود رومیوں ہی کے ایک اور گورنر (ٹائیٹس) کے ہاتھوں اس طرح عمل ہوا کہ نہ ہیکل رہا اور نہ ہیکل کے یہ خدا ——— حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

حضرت مسیحؑ جس قسم کا انقلاب لائے اس کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں آئی۔ نہ ہی انجیل میں اس کی صراحت ملتی ہے البتہ ان دونوں میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس انقلاب کی ایک خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متبعین (حواریوں) نے آپ سے کہا کہ موجودہ نظام کی رو سے جو روٹی انسانوں کے ہاتھوں سے ملتی ہے وہ بڑی ذلت آمیز ہے۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ رزق خدا کے ہاں سے ملے تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا دست نگر اور محکوم نہ رہے۔ اس پر انہیں "آسمانی رزق" ملنے لگا۔ اس "آسمانی رزق" کے اشارات انجیل میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ انجیل متی (باب ۱۱ آیت ۲۸) میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ:

> اے محنت کشو! اے بوجھ سے دبے ہوئے مزدورو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دوں گا۔

دوسری طرف وہ سرمایہ داروں سے کہتے ہیں کہ

> اپنے واسطے زمین پر مال مت جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا لگتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے ہیں اور چراتے ہیں . . . . یاد رکھو! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی - ۶/۱۹-۲۸)

اس کے لئے انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا، اس کا نقشہ، کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ:

> اور جو ایمان لاتے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۲/۴۴-۴۵)

دوسری جگہ ہے:-

> اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں مشترک تھیں..... اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال ۴/۳۲-۳۵)

یہ تھا وہ اقتصادی نظام جسے جناب مسیحؑ نے قائم فرمایا تھا۔

* * *

قرآن کی مخاطب قوم

یہ تھیں اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں جنہیں قرآن کریم نے اپنی سب سے پہلی مخاطب قوم کے سامنے پیش کر کے، ان سے کہا کہ یہ تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں اور ان کے ساتھ ہی، ان اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات بھی جن کے پاس سے تم اکثر گزرتے رہتے ہو۔ تم انہیں بنظرِ غائر دیکھو اور سوچو کہ یہ تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ جس قوم میں اس قسم کے جرائم پیدا ہو گئے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں تک تو تم تاریخی شواہد سے دیکھ سکتے ہو۔ اب اس کے بعد تم اس حقیقت کو سن لو کہ یہ کچھ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہو گیا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو پہلے بھی کارفرما تھا اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ (۳۳/۶۲)

خدا کی وہ روش جو اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں کارفرما تھی، تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا؛

جماعت مومنین

تمہارا نظام بھی اسی قسم کا تخریبی ہے جیسا اُن اقوام کا تھا۔ اس لئے اگر تم نے اسے تبدیل نہ کیا تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہو گا جیسا ان اقوام کا ہوا تھا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۔ (۳۴/۱۹) جس طرح وہ مٹ گئیں اور ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری بھی فقط داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم اپنے لئے کیا چاہتے ہو! شوکت و ثروت اور عزت و آبرو کی زندگی یا تباہی و بربادی کا ہولناک انجام! جن سعید نفوس نے اس پیغام کو بگوشِ ہوش سنا، انہوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح وہ بتدریج جماعتِ مومنین وجود میں آ گئی جس کا مقصدِ حیات ایسا نظام متشکل کرنا تھا جو مستقل اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور اس میں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو جن کا نتیجہ قرآن نے امتوں کی ہلاکت بتایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظام قائم کیا اور آسمان کی آنکھ نے جہاں یہ عبرتناک مناظر دیکھے تھے کہ غلط نظام کے ہاتھوں بڑی بڑی شوکت و سطوت کی مالک قومیں کس طرح راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح اس نے یہ درخشندہ و تابناک منظر بھی دیکھا کہ صحیح اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے سے کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم چند ہی دنوں میں تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس قوم کے جلو میں کس طرح کاروانِ انسانیت رواں دواں اور شاداں و فرحاں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے، اس سکون و اطمینان کے ساتھ کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) نہ اس قافلہ کو بیرونی

خطرات کا کوئی خوف رہتا ہے اور نہ ہی افرادِ کارواں کے لئے قلبی حزن و ملال وجہِ افسردگی اور موجبِ پریشانی بنتا ہے — طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ۔

اس جماعت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور اس کی جانچ پڑتال کرتے رہیں کہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہونے پائے جو قوموں کی تباہی کا موجب بنا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند ایک بنیادی اصولوں کو بھی یاد رکھیں۔ مثلاً:

اصولِ حیات

(۱) تمہیں یہ مقام جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے (۲۴/۵۵) ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی، تمہارا بلند و بالا مقام قائم و دائم رہے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لئے اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر واقع نہ ہونے پائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے۔

(۳) اپنے ہاں معاشی نظام اس قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال و دولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کیلئے کھلے رہیں۔ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو تمہاری جگہ کوئی اور قوم آ جائیگی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تم سے بہتر ہو گی۔ (۴۷/۳۸)

(۴) جب کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱/۱۱) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہیئے اسے وہاں نہ رکھنا۔ ظلم سے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا ان کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۶/۴۵)

(۵) اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہے گی۔ تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلسل مصروفِ جد و جہد رہو اور اس مقصد کے لئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل و توقف دے دو۔ اگر دنیاوی جاذبیتوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا۔ (۹/۳۹) تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ تھے وہ اصول و ضوابط جو خدا نے اس قوم کو دیئے جس نے خدا کے نام پر مملکت قائم کی۔

ملتِ پاکستانیہ

اور وہاں سے آگے بڑھ کر آپ اس قوم کی طرف آ جائیے جس نے تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر خدا کے نام پر قائم کرنے کے لئے ایک مملکت کا مطالبہ کیا اور اسے وہ مملکت عطا کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت اور اس کی حامل قوم کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس قوم کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج و زوال سے متعلق قوانینِ خداوندی اٹل ہیں۔ انہی کے مطابق اقوامِ سابقہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا انہی کی رو سے ہمارے مستقبل کا فیصلہ ہو گا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ۔ اقوامِ سابقہ کے سامنے تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳/۱۳۷) تم دنیا میں چلو پھرو اور

نگہ بصیرت سے دیکھو کہ جن اقوام نے ان قوانین کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ حقیقت کسی خاص قوم، خاص زمانے یا خاص مقام تک محدود نہیں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ۔ یہ تو عالمگیر انسانیت کے لئے واضح حقیقت ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (۳/۱۳۸) دنیا کی جو قوم بھی چاہے کہ وہ ان خطرات سے محفوظ رہے جن سے اقوام سابقہ دوچار ہو کر تباہ ہوئی تھیں تو وہ ان کے احوال و کوائف سے عبرت اور ان قوانین سے راہنمائی حاصل کرے۔

لہٰذا ہمیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کونسی خرابیاں تھیں جو اقوام سابقہ کی تباہی کا موجب بنیں۔ اور پھر اس کا جائزہ لینا کہ وہ خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہو گئیں۔ یہ خرابیاں، قوم بہ قوم گنائی جا چکی ہیں لیکن چونکہ ہم کافی لمبی مسافت طے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس سفر کے بعض سنگ میل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کی مختصری فہرست ایکبار پھر سامنے لے آئی جائے تاکہ اس سے تجدید یادداشت ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کو اچھی طرح سامنے رکھئے کہ بنیادی جرم تو دراصل ایک ہی ہے جس سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے یعنی وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار سے بے اعتنائی برتنا اور معاشرہ کا نظام اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے مطابق متشکل کرنا۔ باقی جرائم اسی اصل کی مختلف شاخیں ہیں لیکن چونکہ وہ جرائم نمایاں اور محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اس لئے ان کے تذکرہ سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اب ان جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمائیے جن کی وجہ سے اقوام سابقہ تباہ ہوئی تھیں۔

تباہ کن جرائم کی فہرست

(۱) جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانے والوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ قوم نوحؑ کے ساتھ ہوا۔

(۲) جب قومیت کا معیار، ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کے بجائے رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

(۳) جو قوم جور و جبر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (EXPLOITATION) اس کا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو اور علوم سائنس میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قوم عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

(۴) جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار — یعنی زمین اور اس کے متعلقات — پر ذاتی ملکیت جائز قرار دے دی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کیلئے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اس کی حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قوم ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(۵) جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے دے اور صارفین (CONSUMERS) سے جتنا جی چاہے وصول کرے، وہ ماپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ ہو، وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قوم شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۶) اور اسی قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور اس کی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے یعنی جہاں نظام سیکولر ہو، وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

(۷) اور قوم لوطؑ کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بدنہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحر مستی میں ڈوب جاتی ہے۔

(۸) قوم فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں انداز ملوکانہ پیدا ہو جائیں وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ انداز ملوکانہ کی ابھری ہوئی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی، ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا

جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر انکی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو اس لئے وہ ہمیشہ ہیئتِ حاکمہ کے تابع فرمان ہیں۔ جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی غیرت و حمیت کے آثار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔

نیز اس نظام میں رزق کے سرچشمے، قوم کی تحویل میں رہنے کے بجائے ہیئتِ حاکمہ کی ذاتی ملکیت متصور ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ، قوم کا اَن داتا بن کر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو انکے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

(۹) قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی ربوٰا اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پہ استوار تھا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں، بشرطیکہ وہ صدقے اور خیرات کے کاموں میں چندہ دیدیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں۔ ان کے لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کر کے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیرٹی (POPULARITY) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشوائیوں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعہ معاش۔ وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام، ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عاید کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی سازباز تھی اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے، اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر کے، اس کی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔ یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۰)

باز بخویشتن نگر

یہ ہے ان جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ اپنے اپنے وقت میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان کی سرگزشتوں کو قرآنِ کریم نے اسلئے بیان کیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقائق اس قدر واضح اور یہ معیار اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں اور ہماری حالت بالکل بے نقاب۔ آپ سوچئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآن کریم نے پیش کی ہے، ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر ہماری حالت یہی ہے اور ہم اپنے موجودہ نظام کو نہ بدلیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں تباہ ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بہی خواہانِ ملت قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے مختلف طریقے سوچ رہے ہیں لیکن معاف فرمائیے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان سب کی نگاہ علاماتِ مرض پر ہے، علتِ مرض پر نہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ عسکری قوت حاصل کر لیں تو پھر ہم ہر طرح سے محفوظ اور مامون رہ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عسکری قوت، قوموں کی حفاظت اور بقا کے لئے لاینفک ہے اور اسکے فراہم کرنے کی قرآن بڑی تاکید کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عسکری قوت کو اگر حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو خود وہی قوت قوم کو تباہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ دیکھئے وہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کیسے واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہو ان سے کہہ دو کہ ذرا تاریخی شواہد پہ نگاہ ڈالو۔ وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ۔ (۴۷/۱۳) کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ قوت

حاصل تھی لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کی قوت انکے کسی کام نہ آئی۔ وہ تباہ و برباد ہو گئیں اور کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔

بعض زور دیتے ہیں کہ یہ دور سائنسی ایجادات کا ہے اسلئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ یہ دور سائنٹیفک ترقیوں کا ہو یا نہ ہو، قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے کہدیا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا، وجہِ امتیازِ آدمیت ہے۔ اسلئے سائنٹیفک ترقیاں ہمارا فریضہ ہے لیکن اگر سائنٹیفک ایجادات کو مستقل اقدار کے سواحل کا پابند نہ کیا جائے تو

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس نے کہا ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے تاریخی نوشتوں کو دیکھو۔ تمہیں ان میں ایسی ایسی قومیں نظر آئیں گی جنہیں سماعت، بصارت اور ذہن رسا کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶/۴۶)۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کے علم و ہنر کی صلاحیتیں ان کے کسی کام نہ آئیں اور وہ انہیں اس تباہی سے ذرا بھی محفوظ نہ رکھ سکیں جس کے متعلق وہ کبھی (SERIOUSLY) سوچا نہیں کرتے تھے وہ ان قوانین و اقدار کو مذاق سمجھتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن حقیقتیں وہی ثابت ہوئیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغربی محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیق و تفتیش کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مثلاً شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف برفا لکھتا ہے:۔

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے، تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوت، تہذیب، کلچر سب بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (P. 259)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔ اگر اسے حل کر لیا جائے تو تمام خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک خدا کا عذاب ہے اور رزق کی فراوانیاں اس کی نعمتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸/۵۸) کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں لیکن انکے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اُجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح چراغِ سحری بجھنے سے پہلے اور تیزی سے جگمگاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم کے ہلاکت کے دن قریب آ جاتے ہیں تو ان کے ہاں دولت سیلاب کی طرح اُمڈ کر آ جاتی ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶/۴۴) ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کر دیتی ہے جن کی انہیں اکثر یاد دہانی کرائی جاتی رہی ہے تو ان پر سامانِ زیست کے سب پٹ کھل جاتے ہیں اور جب وہ دولت و ثروت کی اس قدر فراوانیوں کی رو میں بہہ جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آ جاتی ہے۔ ایسی تباہی کہ انہیں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا، قرآن کریم کی رو سے تنہا روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے ہر آسمانی پیامبرِ انقلاب نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ یعنی اُعْبُدُوا اللّٰهَ۔ جس سے مراد یہ ہے کہ زندگی

کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ جواب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب تک ہیئتِ اجتماعیہ یعنی نظامِ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ قوم ہر لحاظ سے اَلْمُفْلِحُوْن کے مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی دنیا کی کوئی قوم اس کی ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر وہ ان اقدار سے بے اعتنائی برتتی ہے تو سیاسی غلبہ، تسلط، عسکری قوت، حشمت یا معاشی فراوانی و فراخی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایک بار پھر بریفا کے الفاظ سنیئے۔ وہ کہتا ہے

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے (ص ۱۵۹ : ج ۲)

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

یہ ہے قرآن کریم کا آخری فیصلہ جس کی تائید خود مغرب کے دیدہ ور بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے قرآن کریم کی روشنی میں ان اقوام کی سرگزشتوں کا مطالعہ کر لیا ہے جو اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان اقوام میں اگر وہ کبائر الاثم ایک ایک دو دو کر کے ابھرتے تھے تو پاکستان میں وہ سب کے سب یکجا ہو چکے ہیں اور دن بدن زیادہ سے زیادہ پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ واضح ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حالات بڑی مایوس کن ہے لیکن ابھی امید کی کچھ کرنیں باقی ہیں۔ قرآن کریم ہی نہیں یہ بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ان کی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور پر اس قوم کے سامنے آ جاتی ہے اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لے تو اس کے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آ جائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ دیکھئے، سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں (GRAPHICALLY) بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا، تباہ ہو گئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں فروغ حاصل ہو رہا ہے اس لئے اس کا نتیجہ تباہی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہو گئی فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ يَرْكُضُوْنَ اور ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آ گئی تو وہ لگے بھاگنے لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا لَا تَرْكُضُوْا۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ۔ چلو اپنے محلات کی طرف اور اس سامانِ تعیش کی طرف جو تم نے اس طرح فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت کہاں سے لیا تھا۔ وہ مظلوم کونسے تھے جن کے خون کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ چنانچہ جب انہیں گرفتار کر کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم و استحصال سے حاصل کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۱-۱۵) وہ یہ واویلا مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

لہٰذا جس قلبِ حساس میں پاکستان کا درد ہے، اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس میں موجزن، اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائے گی جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔ لیکن اگر ان سے اعراض برتا گیا تو ہماری تباہی یقینی ہے یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔ یاد رکھئے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(پرویز)